شبِ احتساب



شبِ احتساب

علیم الحق حقی

علم و عرفان پبلشرز
34۔ اردو بازار، لاہور، فون: 7352332-7232336
www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

شب احتساب

بنگلے کے لان پر رنگ و نور کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ زرق برق ملبوسات‘ دمکتے چہرے‘ لبوں پر مچلتے تبسم اور خوشبو کی لپٹیں اڑاتے آنچلوں نے لان کو جلوہ گاہ بنا دیا تھا۔ ہر طرف جیسے خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مرد اور عورتیں چھوٹے چھوٹے گروپ کی شکل میں ادھر ادھر موجود تھے۔ کہیں کھنکھناتے قہقہے تھے تو کہیں دل آویز تبسم۔ کہیں سرگوشیاں تھیں تو کہیں بلند آہنگ گفتگو۔ ہر شخص اپنے پسندیدہ انداز میں اس محفل سے حظ اٹھا رہا تھا۔

عثمان حفیظ لان کے اس حصے میں کھڑا تھا‘ جو گیٹ سے قریب تر تھا۔ وہ وہاں مہمانوں کو خوش آمدید کہتا رہا تھا۔ کچھ دیر شہناز بھی اس کے ساتھ کھڑی رہی تھی پھر کسی کو لان میں بچھی ہوئی میزوں کی طرف لے جانے کے بعد واپس نہیں آئی تھی۔ مہمانوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ خوش اخلاق‘ ہنس مکھ اور زندہ دل ہونے کی وجہ سے لوگوں میں بے حد مقبول تھی۔

عثمان نے بیوی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ آخر کار وہ اسے نظر آ گئی۔ اس وقت وہ اشرف علی کے ساتھ کھڑی تھی اور کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ ایک لمحے کو عثمان کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ شہناز کی یہ ہنسی ہمیشہ اس پر جادو کر دیتی تھی۔ ہنسنے کا اس کا خاص انداز تھا۔ سر پیچھے کی طرف ہو جاتا اور چہرہ آسمان کی سمت اور چہرے پر اور آنکھوں میں روشنی سی پھوٹ پڑتی پھر اس ہنسی کا صوتی تاثر! وہ بے حد مترنم اور بے ساختہ ہنسی تھی۔ سننے والے کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ دل میں‘ دماغ میں‘ وجود میں مدھ سے چھلکتی خواہشیں سر اٹھانے لگتی تھیں۔ اس کا اپنا بھی یہی حال تھا۔ برسوں پہلے شہناز کی یہ ہنسی سن کر اسے صرف اور صرف خلوت کی خواہش ہوتی تھی۔ بس وہ ہو اور شہناز ہو اور جب تک یہ نہ ہو جاتا وہ بے چین رہتا۔

مگر یہ سب کچھ اب قصہ پارینہ تھا اب وہی ہنسی سن کر صرف ایک لمحے کو وجود خواہشوں کی نگری بنتا تھا اس کے بعد ایسی کراہت اور بے زاری طاری ہوتی کہ خمار کی کیفیت بھی اس کے سامنے ہیچ ہو کر رہ جاتی۔

اب بھی یہی ہوا۔ ایک لمحے کے بعد اسے اپنا آپ برا لگنے لگا۔ یہ عجیب بات تھی۔ شہناز اسے بری نہیں لگتی تھی لیکن خود سے نفرت ہونے لگتی تھی ایسے میں وہ شہناز کو بہت غور سے دیکھتا۔ اس کی نگاہوں میں اشتیاق نہیں ہوتا تھا۔ ایک جوہری کی سی حرص و ہوس ہوتی تھی' جس کے سامنے کوئی بے حد نایاب اور حسین ہیرا ہو بلکہ کبھی کبھی تو اس کی نگاہوں میں بولہوسی ہوتی۔ چہرہ تمتما اٹھتا۔ آنکھوں سے وحشت جھلکنے لگتی۔

اس وقت بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا'' کیا بات ہے یار؟ بھابی کو کھا جاؤ گے کیا؟ بہت بے صبرے ہو۔''

وہ بری طرح چونکا۔ اس نے سر گھما کر احسان کو دیکھا۔'' ایسی کوئی بات نہیں ہوں۔'' اس نے کھسیا کر کہا۔ احسان اس کا سب سے اچھا دوست تھا۔

'' میرا خیال ہے' سب مہمان آ چکے ہیں۔'' احسان نے سنجیدگی سے کہا'' یا ابھی کسی کا انتظار ہے تمہیں؟''

'' مجھے؟ نہیں تو۔''

'' تو پھر نمٹا دو یہ معاملہ۔ اناؤنسمنٹ کر دوں؟''

عثمان نے اثبات میں سر ہلایا۔ احسان اسٹیج کی طرف چل دیا۔ عثمان نے اپنے خاص ملازم شبیر کو اشارے سے بلایا'' کیک اسٹیج پر پہنچا دو۔'' یہ کہہ کر وہ خود بھی اسٹیج کی طرف چل دیا۔

اسی وقت اسٹیج سے احسان نے اناؤنسمنٹ شروع کر دیا۔'' خواتین و حضرات' پلیز متوجہ ہوں۔'' قہقہے تھم گئے۔ سرگوشیاں معدوم ہو گئیں۔ خاموشی چھا گئی۔ سب کی نظریں اسٹیج کی طرف اٹھ گئیں۔

'' آپ جانتے ہیں کہ آج میرے عزیز دوست عثمان کی شادی کی سالگرہ ہے۔'' احسان مائیک ہاتھ میں لیے کہہ رہا تھا'' اب چند لمحوں میں سالگرہ کا کیک کاٹا جائے گا۔ میں عثمان حفیظ اور بیگم عثمان سے استدعا کرتا ہوں کہ اسٹیج پر تشریف لے آئیں اور آپ تمام خواتین و حضرات بھی تمام تر رونق سمیت اسٹیج سے قریب تر ہو جائیں۔ شکریہ۔''

اس دوران کیک لا کر میز پر رکھا جا چکا تھا۔ بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ گئے۔ سب لوگ اسٹیج کی طرف بڑھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیج کے گرد دائرہ سا بن گیا۔ شہناز اور عثمان اسٹیج پر پہنچ گئے۔ کیک کو باکس سے نکالا گیا تو دیکھنے والوں کی سانسیں رکنے لگیں'' واہ' کتنا خوبصورت کیک ہے۔'' کسی نے کہا۔

'' لیکن یہ دو مکان کیوں بنوائے ہیں کیک میں؟'' ایک اور آواز......

واقعی۔ کیک دو کاٹیجز پر مشتمل تھا جو آمنے سامنے تھے۔ درمیان میں ایک پگڈنڈی تھی جو درمیان سے ٹوٹی ہوئی تھی وہاں ایک گہری کھائی تھی جو دونوں کاٹیجز کا ایک دوسرے سے رابطہ منقطع کر رہی تھی۔

'' بہت خوبصورت آئیڈیا ہے بھئی...... بہت فنکارانہ خیال ہے۔'' کسی نے داد دی۔

کیک اتنا خوبصورت تھا کہ اصل اور اہم بات لوگوں کو دیر میں نظر آئی۔ سب سے پہلے مسز شاہ نے اسے دیکھا'' او...... وہاٹ اے سرپرائز!'' انہوں نے بے حد سریلے پن سے چیخنے کی کوشش کی پھر وہ شہناز کی طرف مڑیں'' پچیس سال ہو گئے تمہاری شادی کو۔ یہ سلور جوبلی ہے۔ بھئی بڑی چھپی رستم نکلیں تم۔ یہ تو بتایا ہی نہیں تھا تم نے۔''

☆☆☆☆☆

اسٹیج پر کھڑی ہوئی مسز شمیم نے برابر کھڑی ہوئی بیگم رضوی سے سرگوشی میں کہا' میرا خیال ہے' اس جوڑے نے ہمارا ایک بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔''

'' کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔'' بیگم رضوی نے جوابی سرگوشی کی۔

'' ارے وہی مسئلہ...... اس سال کے مثالی جوڑے والا۔'' مسز شمیم ذرا جھنجلا گئیں۔

بیگم رضوی تقریباً اچھل پڑیں'' واقعی...... شادی کی پچیسویں سالگرہ۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

'' تم ایسا کرو کہ باقی ممبرز سے بھی رائے لے لو اور آ کر مجھے بتا دو۔ میں کیک کٹنے کے بعد تقریر کرتے ہوئے اناؤنس کر دوں گی۔''

بیگم رضوی سر ہلاتے ہوئے اسٹیج سے اتریں۔ وہ باقی ممبرز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتی رہیں۔ آخر کار انہیں صبیحہ بیگم نظر آ گئیں۔ وہ ان کی طرف بڑھ گئیں۔ مسز شمیم اپنی جگہ کھڑی مسکراتی رہیں۔ وہ مطمئن تھیں کہ ان کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

مسز شمیم نے برسوں پہلے چند خواتین کے ساتھ مل کر انجمن شادی شدہ خواتین کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں' اس میں خواتین کو فرصت ہی فرصت ہوتی ہے' جو آخر کار بیزاری کا روپ دھار لیتی ہے۔ انجمن شادی شدہ خواتین اس مسئلے کا بہترین حل ثابت ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی ممبر شپ بہت تیزی سے آگے بڑھی۔ انجمن کی سرگرمیاں بے حد متنوع تھیں' جو پورے سال جاری رہتی تھیں۔ کبھی اس کے زیر اہتمام کوئی پکنک ہوتی تو کبھی میلہ جشن بہاراں۔ کبھی کسی فنکار کے ساتھ شام منائی جاتی تو کبھی معذوروں کی امداد کیلئے کوئی پروگرام کر لیا جاتا لیکن انجمن کا خاص اور مقبول پروگرام یہ تھا کہ ہر سال ایک جوڑے کو سال کے مثالی جوڑے کا ایوارڈ دیا جاتا تھا۔ اس تقریب کو سماجی حلقوں میں خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

مسز شمیم انجمن شادی شدہ خواتین کی چیئر پرسن تھیں۔ یہ مثالی جوڑے والا سلسلہ انہوں نے شروع تو کر دیا تھا مگر اب وہ اس انجمن کیلئے بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ ہر سال ایک مثالی جوڑے کا انتخاب جبکہ مثالی جوڑے کا محض تصور موجود تھا۔ عملی زندگی میں مثالی جوڑا کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اسکینڈلوں سے بھرے اس معاشرے میں کسی کا دامن صاف نہیں تھا۔ سبھی ایک جیسی ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ فرق یہ تھا

کہ کچھ لوگ ظاہرداری اور بھرم کا خیال رکھتے تھے انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی ازدواجی زندگی بے سکون ہے اور ایسے لوگ بھی تھے جو پردہ نہیں رکھتے تھے۔ کہہ بھی دیتے تھے کہ وہ جیسے تیسے ازدواجی زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے ہیں۔

تو یہ ہر سال مثالی جوڑے کا ایوارڈ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ مسز شمیم جانتی تھیں کہ ہر سال جس جوڑے کو انعام دیا جاتا ہے وہ بظاہر تو بہت خوش ہوتا ہے۔ اپنے ایوارڈ پر فخر کرتا ہے لیکن درحقیقت ایوارڈ ان کی روح کیلئے تازیانہ ہوتا ہے۔ اندر ہی اندر وہ بے چارے بلبلاتے ہیں۔ مسز شمیم انجمن کی عہدے دار خواتین کی ازدواجی زندگی سے خوب واقف تھیں۔ دور کیوں جائیں' ان کی اپنی ازدواجی زندگی بھی کچھ خوشگوار نہیں تھی۔

ایسے میں شادی کی یہ 25ویں سالگرہ مسز شمیم اور انجمن کیلئے نعمت ہی تھی۔ وہ احسان کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ انہیں تقریر کا موقع فراہم کرسکتا تھا۔

☆☆☆☆☆

کیک پر دو اور پانچ کے ہندسوں والی موم بتیاں 25 کی شکل میں لگا دی گئیں۔ احسان نے دیاسلائی جلا کر موم بتیوں کو روشن کردیا۔ ''آؤ عثمان...... آئیں بھابی۔'' اس نے کہا۔

عثمان اور شہناز کیک کے قریب ہو گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر کیک پر لگی موم بتیوں پر جھک گئے۔ اگلے ہی لمحے موم بتیاں بجھ گئیں۔ عثمان نے کیک کاٹنے کیلئے چھری اٹھائی۔ شہناز نے اس کے چھری والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ عثمان نے کیک کو اس جگہ سے کاٹا' جہاں دونوں کاٹیجز کا درمیانی راستہ تھا۔ اس نے کیک کے دو ٹکڑے کاٹے اور ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ سے شہناز کو کھلایا۔ شہناز نے دوسرا ٹکڑا اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں ڈال دیا۔

مبارکباد کا شور مچ گیا۔ خوش و خرم مہمان مبارکباد دے رہے تھے۔

اسی وقت بیگم رضوی آئیں اور انہوں نے مسز شمیم سے سرگوشی میں کہا ''سب ممبر متفق ہیں کہ یہی اس سال کا مثالی جوڑا ہے۔''

سرگوشی بہت دھیمی تھی لیکن عثمان حفیظ نے اسے واضح طور پر سن لیا۔ ایک لمحے کو اس کا چہرہ ست گیا لیکن فوراً ہی اس نے چہرے پر ایک چمکیلی مسکراہٹ کا نقاب ڈال دیا۔ اس نے سر گھما کر بیوی کو دیکھا۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی جسے وہ کوئی مفہوم نہ پہنا سکا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

احسان اس کے پاس آ گیا ''بہت مبارک ہو دوست۔'' وہ بولا۔

''میں تمہاری حالت جانتا ہوں۔ اس وقت تمہارے بس میں ہو تو اس تقریب کو فوراً ختم کرو اور مہمانوں کو رخصت کر کے......'' وہ کہتے کہتے رکا۔ اس کی نگاہوں میں شوخی چمکی ''...... بھابی کے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت گزارو۔ ہے نا یہی بات؟''

''اس سے زیادہ دوستی کے ساتھ شاید ہی زندگی میں کبھی کسی نے مجھے سمجھا ہوگا۔'' عثمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے میں تم سے اجازت لینے آیا ہوں۔ تقریب کچھ اور طویل ہو جائے گی لیکن یہ ضروری ہے انجمن شادی شدہ خواتین کی چیئرپرسن مسز شمیم تمہارے مہمانوں سے مختصر سا خطاب کرنا چاہتی ہیں۔'' احسان نے مختصر پر خاص طور پر زور دیا۔ ''اجازت ہو تو اعلان کردو۔''

''اجازت ہے۔'' عثمان نے شاہانہ انداز میں کہا۔

''شکریہ عالیجاہ۔'' احسان مزاحیہ لہجے میں بولا اور مائیک کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحے بعد اس کی آواز لان میں گونج رہی تھی۔ ''خواتین و حضرات! ازراہ کرم توجہ فرمائیں۔'' توجہ حاصل کرنے کے بعد اس نے مائیک میں کہا ''یہاں انجمن شادی شدہ خواتین کی مسز شمیم موجود ہیں۔ جن سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔ وہ ہم سب کی بے رنگ زندگی میں زندگی بھرنے کا اہتمام کرتی رہتی ہوں۔ مسز شمیم آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتی ہیں اور ایک اہم اعلان بھی انہیں کرنا ہے۔ توجہ فرمائیں...... لیڈیز اینڈ جنٹلمین' مسز شمیم۔''

مسز شمیم بڑے باوقار انداز میں آئیں اور مائیک تھام لیا۔ ''دوستو' میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی......''

عثمان اسٹیج سے اتر آیا۔ لوگوں کی مبارکباد وصول کرتا وہ لان کے ایک نیم تاریک گوشے کی طرف چل دیا۔ درحقیقت اسے اس وقت تنہائی کی شدید ضرورت تھی۔ تنہائی! اور ایسی محفل میں تنہائی؟ محفل بھی وہ جس کا ہیرو وہ خود تھا ایسے میں وہ گھر کے اندر بھی نہیں جاسکتا تھا کہ یہ آداب میزبانی کے خلاف تھا۔ یہ بداخلاقی ہوتی۔

اس نے ایک کرسی گھسیٹی اور اس گوشے میں جا بیٹھا وہاں سے گزرتی ہوئی دو خواتین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''عثمان صاحب خیریت ہے؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا ''یہاں اس طرح کیوں آ بیٹھے ہیں آپ؟''

''کچھ نہیں بیگم خورشید۔ کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے پھر تھکن بھی ہو گئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ دونوں آگے بڑھ گئیں۔ چند قدم آگے جا کر ایک نے دوسری سے کہا ''شراب کی طلب ہو رہی ہوگی بے چارے کو۔''

''پہلو گرم کرنے کی بھی فکر ہو گی اب آج تو یہ ممکن نہیں ہے نا۔'' دوسری بولی۔

یہ جملے کرسی پر بیٹھے ہوئے عثمان نے بھی سن لیے۔ وہ دل ہی دل میں اپنی سماعت کو برا بھلا کہنے لگا' جو وہ باتیں بھی سمیٹ لیتی تھی' جو اس کیلئے نہیں ہوتی تھیں۔ اس کے نتیجے میں بلاوجہ کی اذیت اٹھانی پڑتی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس نے بیگم رضوی کی وہ سرگوشی سن لی تھی' جو مسز شمیم کیلئے تھی۔

اس نے سر اٹھا کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ مسز شمیم بڑے جوش و خروش سے بول رہی تھیں لیکن اس تک بس ان کی آواز پہنچ رہی تھی' لفظ نہیں۔ کیا طرفہ تماشا ہے' یہ میری ساعت۔ وہ بڑبڑایا۔ یہ تقریر سنائی نہیں دے رہی......اور وہ سرگوشی اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔

یہ حقیقت تھی۔ بیگم رضوی کی وہ سرگوشی اس کے کانوں میں مسلسل گونج رہی تھی......سب ممبر متفق ہیں کہ یہی اس سال کا مثالی جوڑا ہے۔

اس کے چہرے پر اذیت کا سایہ سا لہرا گیا۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ یہ کام بھی آج ہی کے دن ہونا تھا۔ آج کے دن! یہ دن تو کسی اور ہی کام کیلئے مخصوص ہے۔ یہ تو نجات کا دن ہے۔ اذیت سے' منافقت سے' گھٹن سے نجات کا دن......ایسے میں یہ ایوارڈ کی بیڑی کیوں چلی آ رہی ہے میری طرف۔

میں اور شہناز......شہناز اور میں۔ مثالی جوڑا! ہنہہ۔ اس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ہاں...... شاید برسوں پہلے کبھی' ابتدا میں...... بالکل ابتداء میں۔ شاید ہم مثالی جوڑا تھے۔ اس وقت جب میری محبت شفاف' بے داغ تھی۔ پرستش کی حد کو پہنچی ہوئی محبت مگر اب......اب تو وہ کوئی بھولا بسرا خواب بھی نہیں رہی۔ اس کی جگہ تو نفرت نے لے لی اور نفرت بھی وہ جو ظاہر نہیں کی جا سکی۔ کچلی ہوئی' مسخ شدہ' قابل نفرت نفرت!

اور وہ دن! شہناز کتنی خوبصورت تھی۔ اسے دیکھ کر سانسیں رکنے لگتی تھیں۔ خیر......خوبصورت تو وہ اب بھی بہت ہے۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ وہ اس کی تردید کرنا چاہتا تھا مگر اس کی فطرت کی معقولیت نے اسے روک دیا۔

اس نے سر اٹھا کر پھر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ اس بار اس کی نظریں شہناز کو تلاش کر رہی تھیں۔ لان کے جگمگاتے قلب میں وہ مسز شاہ کے ساتھ کھڑی باتیں کرتی نظر آئی۔ اس نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ شہناز پہلے کی طرح نہیں' پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہے اب۔ اس کی معقولیت نے اعتراف کیا وہ اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھتا' 25 سال پہلے کی شہناز سے اس کا موازنہ کرتا رہا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس عورت کی عمر 50 سال ہے۔ وہ 35,30 سے زیادہ ہرگز نہیں لگتی تھی۔ کیا انسانوں کی طرح وقت کو بھی دھوکا دیا جا سکتا ہے؟

25 سال پہلے کی شہناز بلاشبہ حسین تھی۔ وہ معصوم اور کم عمر بھی تھی۔ کم عمری کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے پھر اس میں محبت بھی شامل ہو جائے تو سونے پر سہاگا والی بات ہوتی ہے۔ محبت تو نظروں میں حسین رنگ بھر دیتی ہے۔ عثمان جانتا تھا کہ اس وقت وہ شہناز سے محبت کرتا تھا جبکہ اب اسے شہناز سے نفرت تھی لیکن وہ یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ شہناز اب زیادہ حسین ہو گئی ہے پہلے وہ کلی تھی تو اب حسن کے گلستاں کا بے مثال پھول بن گئی تھی۔ پہلے وہ ہلال تھی تو اب ماہ تمام۔ اب تو اس کی شادابی اکسانے والی تھی۔

لیکن عثمان دل کا کیا کرتا' جس میں 27 سال پہلے شہناز چپکے سے اتر گئی تھی اب تو وہ بس یہی سوچ سکتا تھا کہ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔ اسی دن تو اس کی زندگی کے جام میں زہر کا پہلا قطرہ گرا تھا اب تو جام لبریز ہو چکا تھا۔

وہ یادوں کی ڈور تھام کر پیچھے' بہت پیچھے چلا گیا۔

☆☆☆☆☆

شہناز سے تو اس کا رشتہ ہی دکھ کا تھا۔ اس کی پہلی دید کے ساتھ اس کی زندگی کا سب سے بڑا غم پیوست تھا بعض غم ایسے ہوتے ہیں' جنہیں آدمی کبھی نہیں بھولتا۔ وہ غم بھی ایسا ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کوشش کے باوجود شہناز کی پہلی دید کو کبھی نہ بھول سکا۔ اس دید کا ناتا ایسے دکھ سے تھا جو ناقابل فراموش تھا۔

اس روز عثمان کی کائنات لٹی تھی!

امی کا انتقال ہوا تو وہ بارہ سال کا تھا۔ اسے یاد تھا' وہ بہت رویا تھا لیکن امی کی موت کے دن نہیں۔ ہاں' اس کے بعد وہ مسلسل روتا رہا تھا جب بھی وہ کوئی ایسا کام کرتا' جو اس سے پہلے امی اس کیلئے کرتی تھیں' وہ رو پڑتا تھا۔ ایسے ہر موقع پر اسے شدت سے محرومی کا احساس ہوتا تھا۔ رات کے وقت دودھ پینا تو اس نے چھوڑ ہی دیا تھا۔ کون خود جا کر گلاس میں اپنے لیے دودھ لائے اور پھر امی کو یاد کر کے روتا رہے۔

پھر ایک رات وہ بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا کہ ابو نے دھیرے سے اسے پکارا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیے اس کے بیڈ کے پاس کھڑے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا "جی ابو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ دودھ پی لو بیٹے۔" ابو نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ زخم جیسے پھر سے ہرا ہو گیا۔ ابو نے دودھ کا گلاس بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ پر بیٹھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ بچوں کی طرح بلکتا رہا اور ابو اسے تھپکتے چمکارتے رہے۔ جانے یوں کتنی دیر گزری پھر برسات تھمی تو ابو نے اپنے ہاتھ سے دودھ پلایا "میں بہت کم ظرف ہوں بیٹے۔" انہوں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا "اپنے غم میں الجھ کر تمہارے غم کو بھول گیا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ تمہارا غم میرے غم سے کتنا بڑا ہے۔ مجھ سے تو میری شریک سفر چھینی ہے لیکن تم تو اپنی جنت سے محروم ہو گئے ہو۔"

اس نے پھر ابو کے سینے میں منہ چھپا لیا اور سسکنے لگا۔

"نہ روؤ میرے بیٹے۔" ابو نے اسے تھپکتے ہوئے کہا "تم روؤ گے تو وہاں تمہاری ماں تڑپے گی۔ اسے بہت تکلیف ہو گی بیٹے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ اس سلسلے میں وہ پہلی تسلی، پہلی نصیحت تھی جس نے اس کے دل کو چھو لیا تھا۔

''میں تمہیں تمہاری ماں تو واپس نہیں دلا سکتا عثمان۔'' ابو نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''لیکن اپنے عمل سے یہ کوشش ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہیں اس کی محرومی کا احساس نہ ہو اب میں تمہارا باپ ہی نہیں، تمہاری ماں بھی ہوں۔''

اور واقعی ابو نے ماں بن کر دکھایا۔ وہ ہر رات اس کیلئے دودھ کا گلاس لے کر آتے۔ بیڈ پر اس کے ساتھ لیٹ کر اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتے اور جب تک وہ سو نہ جاتا، وہ کمرے سے نہ جاتے۔ کبھی تو اسے ایسا لگتا کہ ابو نہ تو سوتے ہیں اور نہ ہی اس کے کمرے سے جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ اس کی آنکھ کھلی اور اس نے ابو کو خود پر جھکے یا اپنے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے پایا۔ شاید وہ بار بار اس کے کمرے میں آتے تھے شاید وہ سکون سے سو نہیں پاتے تھے۔

عثمان جانتا تھا کہ اس کا باپ دنیا کا سب سے اچھا باپ ہے۔ یہ بات صرف وہ نہیں سمجھتا تھا، تمام لوگ یہی کہتے تھے کہ رئیس صاحب نے بیٹے کیلئے زندگی تج دی ہے۔ بیوی مری تو ان کی عمر ایسی تھی کہ انہیں شادی کر لینا چاہیے تھی پھر وہ صاحب حیثیت تھے انہیں تو کنواری لڑکی کا رشتہ بھی مل سکتا تھا لیکن وہ اپنے بیٹے کو سوتیلی ماں کی مصیبت سے بچانا چاہتے تھے سو انہوں نے خود کو مار لیا۔

رئیس صاحب کی صحت بیوی کی موت کے بعد تیزی سے گرتی چلی گئی تھی۔ اس کا اندازہ ان کے چہرے سے، گرتے ہوئے بالوں سے، آنکھوں کے نیچے پڑنے والے سیاہ حلقوں سے ہوتا تھا لیکن محنت وہ پہلے سے زیادہ کر رہے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ انہیں بیوی کا غم بہت آہستگی اور تسلسل سے چاٹ رہا ہے لیکن عثمان جانتا تھا کہ بات کیا ہے۔

عثمان کی عمر اتنی نہیں تھی لیکن وہ بہت زیادہ سمجھ دار تھا۔ کم عمری میں ماں یا باپ سے محروم ہو جانے والے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ زندگی اور دکھ کا فلسفہ اور آگہی ان پر روشن ہو جاتے ہیں۔ عثمان پر بھی بہت کچھ کھل گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ غم انسان کو کبھی نہیں مارتا۔ مار ہی نہیں سکتا۔ غم میں اتنی طاقت، اتنی سکت نہیں ہوتی۔ انسان ہمیشہ غم سے زیادہ طاقتور ثابت ہوتا ہے۔ اللہ کسی کو غم دینا چاہے تو اس سے پہلے اسے ظرف عطا فرماتا ہے۔ انسان کو کسی آزمائش سے گزارنا ہو تو پہلے وقت کے ہاتھوں اس انسان کی تربیت کراتا ہے۔ اس لیے کہ وہ نہایت رحم والا، بے حد مہربان ہے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ اس کے باپ نے جو ہمیشہ سے اپنی ذمے داریوں کا احساس کرنے والا تھا اب باپ کی ذمے داری کے ساتھ ماں کی ذمے داری بھی اپنے اوپر لاد لی تھی۔ یہ ایک کوہ گراں تھا جس کے نیچے وہ دبتا جا رہا تھا۔ آدمی دن بھر باپ بن کر بیٹے کے مستقبل کی خاطر محنت کرے اور رات بھر ماں بن کر اس کی باطنی ضروریات اور آسائشات کی فکر میں جاگے تو صحت تو تباہ ہونی ہی ہے۔

ماں کی موت کو چار سال ہوئے ہوں گے کہ ایک دن عثمان نے رئیس صاحب سے اس سلسلے میں بات کر ہی لی ''ابو! آپ اپنی صحت کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟'' ایک رات اس نے ان سے کہا۔

''رکھتا تو ہوں بیٹے۔''

''کہاں رکھتے ہیں۔ اپنا حال تو دیکھیے......''

''میں بالکل ٹھیک ہوں عثمان اور کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں۔''

''بات تو ہے ابو۔ آپ رات کو سوتے بھی نہیں۔ اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔''

''یہ کس نے کہہ دیا تم سے کہ میں سوتا نہیں ہوں۔''

''میں خود دیکھ رہا ہوں۔ رات میں جب بھی آنکھ کھلے تو آپ میرے پاس موجود ہوتے ہیں۔''

عثمان کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس کی خاطر اس کی بات مان کر رات کو اس کے کمرے میں آنا چھوڑ دیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی بات مان لیں گے لیکن ایک خیال کے تحت وہ کہتے کہتے رک گیا۔ یہ مطالبہ اس بات کی ضمانت نہیں تھا کہ اس کے بعد وہ سو سکیں گے اگر وہ اپنے کمرے میں جاگتے رہے تو یہ اور برا ہوگا۔ اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ ان کا دکھ اس کے دکھ سے بڑا ہے۔ ان کی محرومی زیادہ خوفناک ہے۔ انہیں دل جوئی کی اس سے زیادہ ضرورت ہے۔ امی اس کی امی تھیں لیکن ابو کی تو وہ شریک سفر تھیں، واحد محرم راز تھیں اب وہ کسی کو اپنا دکھ نہیں سنا سکتے۔ کوئی نہیں، جس سے وہ دل کی بات کہیں۔ وہ تو اپنا ہر دکھ انہیں سنا دیتا ہے۔ اس کی دل جوئی تو وہ بھرپور طریقے سے کرتے ہیں لیکن ان کے سینے پر رکھا پہاڑ تو کسی کو نظر نہیں آتا۔ اسے بھی نہیں......

بہت سوچ کر اس نے ایک بات کہی ''ابو! میری ایک بات مانیں گے؟''

''کہو بیٹے۔''

''آپ یہاں میرے پاس سویا کریں۔ مجھے اکیلے سونا اچھا نہیں لگتا ہے۔''

''اتنے بڑے ہو کر......''

''ابو! آپ کیلئے تو میں بچہ ہی ہوں۔'' اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔

''چلو یہی سہی لیکن بہت عجیب لگے گا۔''

یوں سولہ سالہ عثمان نے اپنے طور پر باپ کو جذباتی تحفظ فراہم کیا۔ اس کا فائدہ ہوا۔ ابو رات کو بے چین ہو کر جاگتے تو وہ بھی بیدار ہو جاتا۔ وہ ان کے سر میں تیل لگاتا۔ ان کے پاؤں دباتا۔ ان سے باتیں کرتا۔ ابو شرمندہ ہوتے کہ انہوں نے اس کی بھی نیند خراب کی۔ یوں ان کے اندر بے خوابی کے خلاف مزاحمت پیدا ہوئی اور وہ سکون سے سونے لگے۔

پھر یہ ہوا کہ وہ ابو سے لپٹ کر سونے لگا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ماں کی محرومی کی وجہ سے چھوٹا سا بچہ بن گیا تھا بلکہ اس لیے کہ ابو اسے چھوٹا سا بچہ لگتے تھے۔ اس کے خیال میں انہیں اس کی ضرورت تھی کوئی ان سے لپٹ کر سوئے۔

وہ تعلیم حاصل کرتا رہا اور ابو کا کاروبار پھیلتا رہا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ابو کے ساتھ بڑی خوبی اور کامیابی سے کاروباری معاملات سنبھالنے لگا۔ اسے اپنے باپ پر فخر تھا۔ دنیا میں کسی کا ایسا باپ نہیں تھا۔

وہ بہولانا چاہتا تھا۔ مجھے خدمت کی ضرورت ہے اور کھیلنے کیلئے ایک پوتا بھی چاہیے۔''

''ابھی نہیں ابو۔'' وہ کہتا۔ وہ چاہتا تھا کہ کاروباری امور کو پوری طرح سمجھ کر ان پر حاوی ہو جائے پھر اس چکر میں پڑے۔ وہ اس بری طرح کام میں الجھا ہوا تھا کہ اس کے پاس فرصت ہی نہیں تھی۔

لیکن ابو کا اصرار جاری رہا ''آخر تم بچ کیوں رہے ہو شادی سے؟'' ایک دن انہوں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''ایسی بات نہیں ابو۔'' اس نے کہا اور اپنے موقف کی وضاحت کی۔

''لیکن یہ ہوگا کب تک۔ کسی وقت کا تعین تو کرو۔''

عثمان تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا ''انشاء اللہ تیس سال کی عمر میں......''

ابو کی نگاہوں سے اداسی جھلکنے لگی ''کہیں دیر نہ ہو جائے بیٹے۔''

''ایسی باتیں نہ کیا کریں ابھی آپ بہت جئیں گے انشاء اللہ۔''

ابو اداسی سے مسکراتے رہے۔ انہوں نے کہا کچھ نہیں۔

یہ تھے اس کے ابو رئیس احمد۔ ایسا باپ' جو ماں بھی ہو' پوری کائنات ہوتا ہے۔ اسی لیے تو ان کے انتقال پر اسے لگا کہ اس کی پوری کائنات لٹ گئی ہے۔ اسے احساس ہوا کہ ماں کا غم تو اس نے اٹھایا ہی نہیں تھا۔ وہ تو پورے کا پورا ابو نے بانٹ لیا تھا۔ اب دونوں غم اس پر ایک ساتھ آئے تھے۔

موت کا دکھ اپنی جگہ لیکن موت پچھتاوے بھی لاتی ہے۔ ہر موت کے ساتھ پچھتاوے لگے ہوئے ہیں یہاں ایک دکھ تو یہ تھا کہ ابو اس سے ہی نہیں' کسی سے بھی کچھ کہے بغیر چپ چاپ چلے گئے۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے اپنی سیکرٹری کو بلانے کیلئے بزر دیا۔ وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دل پر ہاتھ رکھے جھکے ہوئے بیٹھے تھے۔ سیکرٹری کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈھے گئے۔ گھبرائی ہوئی سیکرٹری نے ڈاکٹر کو بلوایا لیکن پنچھی پنجرہ چھوڑ کر اڑ چکا تھا۔

عثمان حفیظ کیلئے وہ زندگی کا تاریک ترین دن تھا۔ اس روز وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سب کچھ سن رہا تھا لیکن سنائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا لیکن کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ عجیب کیفیت تھی اس کی۔ وہ جیسے کسی خلا میں معلق تھا۔ ایک پچھتاوا تھا کہ اپنا زہریلا ڈنک اس کے وجود میں چبھوئے جا رہا تھا۔ ابو کو بہولانے کا' اپنے پوتے کو کھلانے کا کتنا ارمان تھا۔ وہ ان کی یہ آرزو بہ آسانی پوری کر سکتا تھا لیکن اس نے مجرمانہ غفلت برتی تھی اور ابو اپنا ارمان دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اف......! کیسا دکھ تھا یہ' کیسا پچھتاوا تھا۔ ان لمحوں میں اس نے سوچا کہ اب

کبھی شادی نہیں کرے گا۔ اب شادی کیوں......اور کس کیلئے۔ اپنے لیے؟ ہرگز نہیں۔ یہی تو وہ سزا ہے جو اسے ملنی چاہیے۔ وہ اب زندگی بھر تنہا رہے گا۔

گھر میں لوگوں کا ہجوم تھا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابو اور امی دونوں ہی کے قریبی رشتے دار اس دنیا میں نہیں تھے۔ دور پرے کے رشتے دار تھے جن سے ابو اور امی بھی کم ہی ملتے تھے۔ وہ سب کے سب وہ لوگ تھے جن سے انہیں تکلیفیں پہنچی تھیں لیکن اس وقت وہ سب جمع تھے اور اس کی دلجوئی میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے مگر عثمان تو اس وقت اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھا۔

تدفین کا مرحلہ قیامت کا تھا لیکن وہ قیامت ہی اسے ہوش میں لے آئی۔ ابو کو لحد میں اتارا جا رہا تھا۔ وہ رخصت ہو رہے تھے۔ تمام تر ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اب اس چہرے کو وہ کبھی نہیں دیکھ سکے گا اب اس جسم سے وہ کبھی نہیں لپٹ سکے گا اب یہ ہاتھ کبھی اسے پیار سے نہیں چھوئیں گے کبھی اس کا سر نہیں سہلائیں گے۔ اسی لمحے گھپ اندھیرے میں کرن سی چمکی۔ اس کے وجود میں طمانیت ابھری اور ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ۔ دیکھنے والے دل دہل گئے کہ شاید وہ پاگل پن کی حدود میں داخل ہو رہا ہے لیکن اس کی طمانیت سچی تھی۔ اس نے سوچا' جسد خاکی تو مٹی کے سپرد کر دیا گیا لیکن ابو میرے دل میں' میری یادوں میں زندہ ہیں اور رہیں گے۔

تدفین کے بعد وہ گھر واپس آیا تو سنبھل چکا تھا۔ نام نہاد رشتے داروں کے سوا سب لوگ رخصت ہوتے گئے۔ سب سے آخر میں نجم صاحب رخصت ہوئے۔ وہ اس کے ابو کے سب سے اچھے دوست تھے۔ انہوں نے رخصت ہوتے وقت بڑی شفقت سے اسے لپٹایا اور بولے ''بیٹے کسی بھی وقت' کسی بھی سلسلے میں میری ضرورت پڑے تو بلا جھجک مجھے رنگ کر دینا۔ رئیس کا بیٹا میری لیے میری اولاد سے کم نہیں۔

''شکریہ انکل۔''

نجم صاحب نے سرگوشی میں کہا ''یہ تمہارے رشتے دار وہ ہیں جن سے ماں باپ کبھی خوش نہیں رہے۔ تم انہیں ہینڈل کر سکو گے؟''

''جی انکل۔ آپ فکر نہ کریں۔''

ہوا بھی یہی۔ عثمان نے اپنے رشتے داروں کو بڑی کامیابی سے ہینڈل کیا۔ تیسرے روز فاتحہ کے بعد اس نے انہیں رخصت کر دیا۔ کسی حد تک بدمزگی بھی ہوئی کیونکہ ان میں کچھ ایسے تھے جو اپنا گھربار چھوڑ کر زندگی بھر اس کا غم بانٹنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کچھ اس کا گھر بسانا چاہتے تھے اور ان کے خیال میں اس کیلئے مناسب ترین شریک حیات ان کی دختر نیک اختر تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو' ان میں سے کوئی بھی اسے اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے ان پر واضح کر دیا کہ اسے تنہائی کی ضرورت ہے۔

گاڑی بہرحال چلنے لگی۔ اس نے خود کو کاروباری معاملات میں الجھا لیا کہ غم سے فرار کی یہی سب

سے اچھی صورت تھی۔ دن بھر وہ خود کو خوب تھکاتا۔ رات کو نیند نہ ہونے کے باوجود وہ تھکن ہی اسے تھپک تھپک کر سلا دیتی پھر بھی بہت دیر تک اسے کروٹیں بدلنا پڑتیں۔

وہ ابو کے انتقال کے بعد ساتویں رات تھی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے اس کے ساتھ عجیب واقعہ ہوا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک حسین لڑکی کا دل نشین چہرہ ایسے ابھرا جیسے دھوئیں نے کوئی شکل اختیار کر لی ہو مگر وہ چہرہ نظروں کے سامنے سے ہٹنے والا نہیں تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس کے اندر کی کیفیت بدل گئی ہے۔ دل کی دھڑکنوں میں خوش گواریت سی تھی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی سرشاری اور انبساط کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

وہ کھلی آنکھوں سے اس چہرے کو تکتا رہا۔ وہ مبہوت ہو گیا تھا۔ اس کا ذہن یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو کب اور کہاں دیکھا ہے۔ یادداشت اس کی تردید کر رہی تھی کہ اس نے اسے دیکھا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس نے کبھی کسی لڑکی کو اتنے غور سے نہیں دیکھا۔ پہلے کبھی اس کے تصور میں کوئی چہرہ نہیں آیا۔ بلاشبہ اس نے زندگی میں سینکڑوں لڑکیوں کو دیکھا تھا لیکن اسے ان میں سے کسی کی صورت یاد نہیں تھی۔

مگر یہ چہرہ بھی فرضی تو نہیں۔ ذہن نے دلیل دی۔

پھر اس کے تصور میں اس چہرے کا گردوپیش دھیرے دھیرے واضح ہونے لگے۔ لڑکی کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ اردگرد کئی عورتوں کے سوگوار چہرے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ ابو کے انتقال کے موقع پر اسے نظر آئی ہو گی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ لڑکی تعزیت کیلئے آنے والی کسی فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ صدمے اور دکھ سے نڈھال تھا۔ وہ اس کے شعور تک نہ پہنچ سکی لیکن لاشعور نے اس کے عکس کو محفوظ کر دیا اور اب چپکے سے ریلیز کر دیا ہے۔

بے بسی یہ تھی کہ وہ یہ یاد نہیں کر سکتا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ اسے خود پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ کس حال میں وہ کیسا بکھیڑا لے بیٹھا۔ زندگی کے سب سے بڑے غم کے دوران اس نے خوشی تلاش کی اور جس طرح وہ چہرہ اس پر حاوی آ رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ اس وقت اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ قبروں پر گلاب کے پھول نہیں کھلتے۔ اس رات وہ سو نہیں سکا۔ وجہ دکھ نہیں تھا' محبت کی کسک تھی۔ اس محبت سے بھاگنے والے کو پہلی نظر کی محبت ہو گئی تھی۔

اسے خوف تھا کہ اس لڑکی کا تعلق اس کے کسی مطلبی رشتے دار سے ہی نکلے گا۔ ابو کی موت کے تین دن تک وہی لوگ چھائے رہے تھے۔ بہرکیف اسے تو اس لڑکی کو تلاش کرنا تھا۔ وہ ایک ایک رشتے دار کے ہاں ان کا شکریہ ادا کرنے گیا تھا۔ وہ سب اس کے سامنے بچھ بچھ گئے لیکن گوہر مقصود اسے نہ مل سکا۔ متلاشی نگاہوں کو مایوسی کے سوا کچھ میسر نہ آیا۔

وہ مایوس ہونے لگا۔ کیا وہ چہرہ محض اس کا تصور ہے۔ تخیلاتی ہے؟ ایسا ہے تب بھی اسے ڈھونڈ نکالنا ضروری ہے۔

ایک دن نجم صاحب دفتر آئے اور اس سے ملے۔ اس عرصے میں انہوں نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ کاروباری معاملات میں انہوں نے اسے بہت قیمتی مشورے دیئے تھے۔ بہت کام کی نصیحتیں کی تھیں۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے اندر جو کمی رہ گئی تھی' انہوں نے پوری کر دی ہے۔ اب وہ اپنا کاروبار خود سنبھال سکتا تھا۔ ساتھ ہی وہ ان کے خلوص اور محبت کا قائل ہو گیا تھا۔

اس روز نجم الحسن نے اس سے کہا ''عثمان میاں' تم ہمارے ہاں کبھی نہیں آئے۔ تمہاری چچی ہمیشہ تمہیں پوچھتی ہیں۔ مجھ سے لڑتی ہیں کہ اسے ساتھ کیوں نہیں لاتے۔''

''بس انکل' مصروفیت ہی ایسی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں تم نے اپنے اطراف مصروفیت کا انبار لگا لیا ہے۔ جانتا ہوں کہ تم کس چیز سے لڑ رہے ہو لیکن میاں' جنگ میں اپنے حلیفوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں انکل......''

''بس آج تم میرے ساتھ گھر چلو گے۔'' نجم الحسن نے حتمی لہجے میں کہا ''میں چھ بجے تمہیں لینے آؤں گا۔ اس وقت تک کام نمٹا لینا۔''

عثمان کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن ایسے خلوص اور محبت سے منہ بھی نہیں موڑا جا سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ نجم صاحب کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ کاروباری طور پر وہ اس سے کہیں زیادہ مستحکم تھے۔ اس نے ہامی بھر لی۔

چھ بجے نجم صاحب اسے لینے آئے۔

ڈیفنس سوسائٹی میں نجم صاحب کا خاصا خوبصورت بنگلا تھا۔ ان کی بیگم عثمان سے بڑے تپاک اور محبت سے ملیں۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ''بیٹے آتے رہا کرو یہاں۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ ہاں' یہ بات میں رسماً نہیں کہہ رہی ہوں۔''

''شکریہ آنٹی''

انہوں نے اسے اپنے دونوں بیٹوں سے ملوایا۔ سعود اور محمود کی عمریں اٹھارہ اور بیس کے لگ بھگ ہوں گی۔ دونوں بہت خوش اخلاق اور ملنسار لگے۔ ان کے انداز میں عثمان کیلئے محبت اور احترام تھا۔ دونوں ہی ابھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

ان کے درمیان کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور پھر نجم صاحب نے کہا ''بھئی لان پر چلو۔ چائے وہیں پئیں گے۔''

وہ لان پر آ گئے۔ وہاں کرسیاں بچھی تھیں۔ عثمان کو لان بہت پسند آیا۔ اس کی ترتیب میں نفاست

اور سلیقہ تھا۔ پودوں میں کوئی ایک پتا' کوئی ایک ٹہنی فاضل نہیں' گھاس ہموار تھی۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ہر لمحے اس کی نگہداشت کی جاتی ہے' ''آپ کا مالی یقیناً بہت اچھا اور محنتی ہے اور درختوں اور پودوں سے محبت بھی کرتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''تمہاری سب باتیں درست ہیں بس ایک بات غلط ہے۔ وہ مالی نہیں' مالن ہے۔'' نجم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا' ''ابھی تمہیں اس سے ملوائیں گے۔ لو وہ آ گئیں۔''

عثمان نے اشارے کی سمت دیکھا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ وہ لڑکی چائے کی ٹرالی دھکیلتی اس طرف آ رہی تھی۔ اس کے سر پر آنچل تھا۔ چہرہ بھی اوٹ میں تھا۔ بہر حال لباس سے اور اپنے پر اعتماد انداز سے وہ مالن نہیں لگ رہی تھی۔

وہ ٹرالی لے کر آئی تو اس کے چہرے کی سائیڈ عثمان کی نظروں کے سامنے تھی۔ پھر وہ سلیقے سے پیالیاں سب کے سامنے میز پر رکھنے لگی۔

''یہ ہماری مالن بھی ہے' باورچن بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری چہیتی بیٹی ہے...... شہناز ہے۔'' نجم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پاپا......'' اُس کے لہجے میں شکایت تھی۔

لیکن عثمان کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ تو بس ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہے تھا جس چہرے کو تلاش کرتے کرتے وہ مایوس ہو چکا تھا' وہ خلاف توقع اس کے روبرو تھا۔ اس کا دل اس کے نام کی گردان کیے جا رہا تھا۔ شہناز' شہناز' شہناز......

اسی لمحے شہناز نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی والہانہ نظروں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کا سایہ سا لہرا گیا۔ اسے اس کا یوں دیکھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

لیکن عثمان اس وقت ہر چیز سے بے نیاز تھا!

☆☆☆☆☆

مسز شمیم کی تقریر جاری تھی۔ شہناز کے ساتھ اس وقت مسز مسعود کھڑی تھی۔ وہ بھی مسلسل بول رہی تھی۔ شہناز یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ پوری توجہ سے ان کی بات سن رہی ہے۔ وہ کبھی اثبات میں سر ہلاتی' کبھی نفی میں اور کبھی پرزور لہجے میں جی ہاں' یہی بات ہے۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہہ دیتی۔ درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

بیگم رضوی کی وہ سرگوشی اس نے بھی سن لی تھی۔

یہ سن کر اسے شاک لگا کہ اسے اور عثمان کو اس سال کا مثالی جوڑا قرار دیا جا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد مسز شمیم اس کا باقاعدہ اعلان کر دیں گی۔ فوری طور پر تو اس بات کا تاثر اس پر پوری طرح مرتب نہیں ہو سکا تھا مگر اب جیسے وہ قطرہ قطرہ دریا بن رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے اندر تمسخر امنڈ رہا تھا۔

25 سال پر پھیلی ہوئی منافقت بھری ازدواجی زندگی اور مثالی جوڑے کا ایوارڈ!

لوگ سمجھتے ہیں کیا ہیں۔ یہ ایوارڈ ہے ہی احمقانہ۔ دنیا میں مثالی جوڑے کا وجود ہے کہیں؟ اور ہر سال ایوارڈ دیئے جاتے ہیں۔ کبھی اپنی ازدواجی زندگی کے آئینے میں دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کرتے۔

وہ جانتی تھی کہ اس تقریب میں موجود ہر شخص کیسی ازدواجی زندگی گزار رہا ہے۔ سب کے ہاں تلخیاں' بے وفائیاں اور منافقتیں تھیں۔ معاشرے سے ڈرنے والوں میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اپنا اصلی روپ دکھا سکتے۔ کسی اور کو کیا کہتی۔ اس کا اپنا بھی یہی حال تھا۔ پچھلے بیس سال سے عثمان مے نوشی اور عیاشی میں مبتلا تھا۔ تقریباً اتنے ہی عرصے سے ان دونوں کے درمیان محبت کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ سلسلہ دوطرفہ نہیں' یک طرفہ تھا۔ بہر حال تھا تو سہی لیکن منافقت کے بیس سال! بیس سال بہت ہوتے ہیں۔ اتنے عرصے میں تو عادت بدفطرت ثانیہ کا روپ دھار لیتی ہے۔ اتنے عرصے میں تو جھوٹ سچ اور سچ جھوٹ بن جاتا ہے۔

شہناز کو تقریباً ستائیس سال پہلے کا وہ دن بہت اچھی طرح یاد تھا۔ وہ اس کی زندگی کا تاریک ترین دن تھا۔ اس روز عثمان پہلی بار اس کے گھر آیا تھا اگر عثمان سے اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو آج وہ دن اسے یاد بھی نہ ہوتا لیکن اب تو وہ اس دن کو کبھی بھول ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ یادوں میں کھو گئی!

☆☆☆☆☆

اس نے چائے کی پیالی عثمان کے سامنے رکھتے ہوئے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سا ضدی پن تھا اور انداز بے حد والہانہ تھا۔ شہناز کو بہت برا لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر ناگواری کا سایہ سا لہرا گیا۔ کیسا شخص ہے یہ؟ اس نے سوچا۔ اسے لڑکیوں کو دیکھنے کا سلیقہ بھی نہیں۔

''چینی کتنی ڈالوں؟'' اندر کی ناگواری اس لہجے میں بھی در آئی۔

وہ بری طرح چونکا اور گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

''آپ نے جواب نہیں دیا۔''

''جتنی جی چاہے' ڈال دیں۔'' وہ گڑبڑا کر بولا۔

''شہناز جل کر رہ گئی۔ اس نے بڑے اہتمام سے آدھا چمچہ چینی اس کی چائے میں ڈالی اور دیر تک ہلاتی رہی' جیسے صرف ہلانے سے چائے میٹھی ہو جائے گی۔

لیکن عثمان نے وہ چائے بڑی رغبت سے پی۔ اس روز وہ رات کے کھانے تک رکا رہا۔ ممی اور پاپا اس کے سامنے بچھے جا رہے تھے۔ وہ تمام وقت کڑھتی رہی اور کوشش کرتی رہی کہ اس کے سامنے ہی نہ آئے مگر یہ کہاں ممکن تھا۔

اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس شخص کی موجودگی میں تنہائی اور سکون ممکن نہیں۔ اس کی جھنجلاہٹ حد سے گزری تو اس نے سر اٹھایا اور براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنا شروع کر دیا۔ اس پر عثمان چند لمحوں میں ہی گڑبڑا گیا اور نظریں نیچی کر لیں۔

تاہم شہناز اسے دیکھتی رہی اب وہ اسے غور سے اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اندر کی سختی نرمی میں تبدیل ہونے لگی۔ جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی' تھا ہی کچھ ایسا۔ اسے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ وہ بے حد خوبرو جوان ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش سے مزاج کی نرمی ہویدا تھی۔ اس کا انداز مہذبانہ تھا۔ آواز اور لہجے میں عجیب سی مٹھاس' نرمی اور دل نشینی تھی۔ غرض ہر زاویے سے وہ کوئی ہیرو ہی لگتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی نگاہوں میں اس کیلئے وارفتگی تو تھی لیکن وہ ہوس اور گرسنگی نہیں تھی جس سے اس کا زیادہ تر واسطہ پڑتا تھا۔ مختصر یہ کہ دنیا کی کوئی بھی لڑکی اس کی محبت میں گرفتار ہو سکتی تھی بلکہ جانے کتنی تو اب تک ہو چکی ہوں گی۔ اسے دیکھتے ہوئے شہناز نے سوچا۔

لیکن شہناز ایسی لڑکیوں میں شامل نہیں تھی...... ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

پہلی بات تو یہ کہ اس کا مرد کا تصور بے حد مختلف تھا۔ اس کے نزدیک سخت ہونا ایک خالص مردانہ وصف تھا۔ نرمی کو وہ نسوانی خوبیوں میں شمار کرتی تھی۔ مرد صنف قوی ہے سو اسے قوی نظر آنا چاہیے۔ اس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔ وہ کسی بحران میں کوئی کمزوری نہ دکھائے بلکہ مردانہ وار اس کا سامنا کرے۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ مرد ہی کیا جو عورت کو رلانا بھی نہ جانتا ہو بلکہ عورت کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہے۔ ایسا مرد عورت کو تحفظ کا وہ احساس کیسے دے سکتا ہے جو عورت کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ اسے وہ مرد مرد لگتے تھے جو جارحانہ رویے کے حامل ہوتے' نروس ہو جانے والے مرد اسے مرد ہی نہیں لگتے تھے۔

اس نے پہلی بار عثمان حفیظ کو اس دن دیکھا تھا جب اس کے ابو کا انتقال ہوا تھا۔ وہ امی کے ساتھ اس کے گھر گئی تھی۔ اس روز وہ بہت غور سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ اس کی ظاہری شخصیت کے بارے میں اس روز بھی اس نے اسی انداز میں سوچا تھا۔ وہ اسے چاہے جانے کے قابل لگا تھا۔ بہت ڈیشنگ پرسنالٹی تھی اس کی اگر شہناز کی زندگی میں پہلے ہی مشکور نہ آ گیا ہوتا تو شاید وہ اس دن اسے دل دے بیٹھتی۔

لیکن اس روز بھی اس کی شخصیت کا دکھ کے سامنے سرنگوں ہونے والا پہلو اسے اچھا نہیں لگا۔ عثمان نے اس روز اسے بس ایک نظر دیکھا تھا اور وہ بھی شہناز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دکھ سے نڈھال اس خوبرو جوان کو نہ کچھ دکھائی دے رہا ہے' نہ سنائی دے رہا ہے۔ اس کیلئے تو یہی بڑا کمال تھا کہ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر نہیں رویا تھا...... عورتوں کی طرح بین کر کے نہیں رویا حالانکہ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اپنے اندر وہ بین بھی کر رہا ہے اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو بھی رہا ہے۔ شہناز کو اس کا یہ عورت پن ذرا اچھا نہیں لگا۔ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا۔ اس کی عمر 25 سے

[illegible] ہو لی اور اتنی عمر میں تو آدمی کو موت کی حقیقت سے آگہی ہو ہی جاتی ہے جبکہ وہ تو اس سے پہلے ماں سے محروم ہو چکا تھا۔ موت اور اس کا دکھ اس کیلئے نیا نہیں تھا پھر ایسی کم ظرفی کیوں؟

شہناز کو ایک لمحے کو بھی یہ نہ سوچا کہ دکھ کی آگہی دکھ کو کم نہیں کرتی۔ ایک موت دیکھ لینے سے دوسری موت کا صدمہ نہیں گھٹتا۔ دکھ کو اس طرح جھیلنا کہ اندر آنسوؤں کا بپھرا ہوا سمندر ہو اور آنکھیں نم نہ ہوں' کمزوری نہیں' مضبوطی ہے۔ نسوانیت نہیں' مردانگی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکی کہ ماں کے کھونے کے بعد باپ کو کھونا دہرا دکھ ہوتا ہے۔ ہر نئی موت اپنے ساتھ ہر پچھلی موت کا دکھ بھی لاتی ہے۔ اس معاملے میں تجربہ کسی کام نہیں آتا لیکن شہناز یہ بات نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس نے اب تک کسی کو کھویا ہی نہیں تھا۔

شہناز اب بھی عثمان کو دیکھے جا رہی تھی شاید ان نسوانی کمزوریوں کے باوجود وہ اس خوبصورت شخص کی محبت میں گرفتار ہو جاتی لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ پہلے ہی کسی کی اسیر ہو چکی تھی۔ مشکور علی کی!

مشکور اس کیلئے آئیڈیل مرد تھا۔ وہ ہر اعتبار سے اس کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ وہ اس سے کالج میں ملی تھی اور فوراً ہی متاثر ہو گئی تھی۔ اس میں وجاہت سے زیادہ جو مردانہ پن تھا وہ اس کیلئے باعث کشش تھا۔ وہ ایک سرکاری افسر کا بیٹا تھا۔ ذہین' پرجوش اور اولوالعزم تھا لیکن پڑھائی کی طرف اس کی پوری توجہ نہیں تھی۔ اس کے برعکس اسپورٹس میں وہ زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔

کالج میں مشکور شہناز سے دو سال سینئر تھا۔ بی اے میں اس نے سیکنڈ ڈویژن لی اور پھر پڑھائی چھوڑ کر ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کر لی۔ شہناز اس کے کالج چھوڑنے کے بعد بھی اس سے ملتی رہی۔ وہ اکثر اس کی ملازمت کے سلسلے میں اسے چھیڑتی۔ درحقیقت یہ مشکور کا کمزور ترین پہلو تھا۔ شہناز جانتی تھی کہ اس ملازمت میں مشکور کا کوئی روشن مستقبل نہیں ہے۔ خود اسے تو اتنی پروا نہیں تھی لیکن جانتی تھی کہ جب بھی شادی کا مسئلہ کھڑا ہو گا' پاپا اس کمزوری کی بنیاد پر اس رشتے پر ہچکچائیں گے۔

''ارے...... یہ تو میں صرف تجربہ حاصل کرنے کیلئے ملازمت کر رہا ہوں۔'' مشکور ہمیشہ خوش دلی سے کہتا ''میری اڑان کا تو تمہیں پتا ہی نہیں ہے۔ دیکھنا' میں بہت کچھ کروں گا۔ یہ دنیا تمہیں میرے قدموں میں پڑی نظر آئے گی۔ مجھے تو کائنات کو تسخیر کرنا ہے۔''

اور شہناز فخر سے اسے دیکھتی رہتی۔

تو مشکور جیسے مرد کے ہوتے ہوئے شہناز عثمان کو بھلا کیسے خاطر میں لاتی۔ اسے تو اس کی والہانہ نگاہیں بہت بری لگتیں۔ اسے الجھن ہوتی تھی۔ اس نے جان لیا کہ اگر ان نگاہوں سے واسطہ پڑتا رہا تو وہ اس سے چڑنے لگے گی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ کاتب تقدیر نے اسے اس کا مقدر کر دیا ہے......

☆☆☆☆☆

''ازدواجی زندگی بے حد اہم چیز ہے......'' مسز شمیم کہہ رہی تھیں۔

عثمان حفیظ نے سر جھکا۔ بے شک۔ وہ بڑبڑایا۔ اس سے کم از کم میں انکار نہیں کر سکتا۔

اداسی اس کے وجود میں سرایت کر رہی تھی۔ دل بہت بوجھل ہو گیا تھا۔ ایک پہاڑ سا بوجھ پچیس سال تک اٹھا کر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان تازہ دم رہے۔ ماندگی اور اداسی نہ کمائے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بیتے دنوں کی فلم سی چلنے لگی۔ مسز شمیم کی آواز معدوم ہوتی گئی۔

وہ سرشاری اور بے خودی کے عجیب عالم میں تھا۔ کام کے دباؤ میں بھی شہناز کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتا تھا۔ فرصت کے لمحوں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ان میں تو وہ شہناز سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ محبت کیسا طاقتور اور دل آویز جذبہ ہے۔ اس میں تو ہر سانس لذت آمیز ہوتی ہے۔

ہر شام اس کا جی چاہتا کہ دفتر سے اٹھے تو اپنے گھر کے بجائے نجم صاحب کے گھر چلا جائے وہاں سب کچھ بھول کر شہناز کو تکتا رہے لیکن وہ خود سے لڑتا اور اپنے گھر چلا جاتا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنے گھر جانے کے ارادے سے نکلتا اور پھر خود کو ڈیفنس جانے والی سڑک پر ڈرائیو کرتے پاتا۔ یہ کیا مصیبت ہے' کیا میرے ارادے بھی محبت کے تابع ہو جائیں گے؟ وہ جھنجلا کر سوچتا اور گاڑی کا رخ موڑتا۔

نجم صاحب کے گھر جانے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ پچھلی بار اسے رخصت کرتے وقت فہمیدہ آنٹی نے اسے آتے رہنے کو اس کثرت سے کہا تھا کہ اسے شرمندگی ہونے لگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اصرار رسمی نہیں ہے بلکہ خلوص پر مبنی ہے۔ اسے علم تھا کہ وہ جائے گا تو اسے بہت گرم جوشی سے خوش آمدید کہا جائے گا پھر بھی وہ وہاں جانے سے بچ رہا تھا۔ اس لیے کہ اسے یقین تھا کہ ایک بار اس نے خود کو اس معاملے میں ڈھیل دے دی تو پھر وہ ہر روز وہاں جانے لگے گا۔ وہ خود کو کبھی نہیں روک سکے گا اور قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا۔

دو ہفتے اس نے جیسے تیسے گزارے مگر اب اس کی بے تابی بڑھ گئی تھی۔ وہ شہناز کی صورت دیکھنے کیلئے تڑپ رہا تھا۔ اس کا ضبط جواب دے رہا تھا لیکن ایک اور دفاعی حصار سامنے آ گیا تھا۔ اُس نے اُس سے کہا تھا کہ وہ وہاں آئے۔ لیکن اس کے باوجود وہ وہاں نہیں گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے ان کے اصرار کی' خلوص کی توہین کی ہے۔ وہ لوگ یقیناً ناراض ہوں گے اس لیے نجم صاحب نے بھی اس سے رابطہ نہیں کیا اب وہ ان کے گھر جائے تو کس منہ سے جائے۔

تین دن اور گزرے تو اس نے سمجھ لیا کہ اب وہ بن بلائے ان کے گھر نہیں جا سکے گا اب وہ یہ دعا ہی کر سکتا تھا کہ وہ خود اسے بلائیں۔

اور اس کی دعا قبول ہو گئی۔

اس روز فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا ''عثمان حفیظ اسپیکنگ۔''

''ہم سے ناراض ہو عثمان؟'' دوسری طرف سے کسی نسوانی آواز نے پوچھا۔

''جی...... میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''میں تمہاری فہمیدہ آنٹی بول رہی ہوں۔''

اس کا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ جیسے سینے سے نکل آئے گا۔ ''سوری آنٹی...... رئیلی سوری کہ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔''

''کوئی بات نہیں۔ فون پر پہلی بار میری آواز سنی ہے نا۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اتنے دن ہو گئے۔ تم ہمارے گھر نہیں آئے۔ ہم سے ناراض ہو گیا؟''

''ارے نہیں آنٹی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر؟ ہم شاید اپنے خلوص کا پوری طرح تمہیں یقین نہیں دلا سکے۔ میں نے تو اتنی بار کہا تھا کہ میں تم سے رسماً نہیں کہہ رہی ہوں۔ تمہارا آنا ہمیں اچھا لگے گا۔ وہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔''

''میں جانتا ہوں آنٹی لیکن کیا کروں' مصروفیت ہی اتنی ہے۔''

''میں جانتی ہوں اسی لیے تو کہتی ہوں کہ روز آ جایا کرو۔ آدمی دکھ سے لڑتا ہے تو مصروفیت ہی کو ہتھیار بناتا ہے پھر اکیلے گھر جانے کا تصور بھی دفتر سے نہیں اٹھنے دیتا ہو گا۔''

عثمان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ کیسی گہرائی میں محسوس کر کے کیسی سچی بات کہی ہے انہوں نے۔ کوئی کسی غیر کو اس طرح محسوس کر سکتا ہے۔

''پھر یہاں بھی سب تمہارے گرویدہ ہو گئے ہیں۔'' آنٹی کہہ رہی تھیں ''میرے دونوں بیٹے روز تمہیں یاد کرتے ہیں۔ بس آج شام آ جاؤ۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے۔''

''ٹھیک ہے آنٹی۔''

ریسیور رکھنے کے بعد وہ یوں ہانپتا رہا' جیسے میلوں دوڑا ہو۔ آنٹی نے کہا تھا' سب گرویدہ ہو گئے ہیں تو کیا شہناز بھی......؟

اس شام وہ سینے میں رقصاں دل لیے نجم صاحب کے گھر چلا گیا۔ واقعی وہ اس کے منتظر تھے۔ دونوں لڑکے اس سے یوں ملے' جیسے وہ کوئی ان کا برسوں کا بچھڑا بھائی ہو۔ ان کا بس چلتا تو وہ اپنے آپ کو اس پر نچھاور کر دیتے۔ ان کے پاس موضوعات کی بھی کمی نہیں تھی۔ کرکٹ' ٹینس' سیاست' تعلیم۔

''انکل نظر نہیں آ رہے؟'' عثمان نے آنٹی سے پوچھا۔

''وہ تو اچانک ایک کاروباری دورے پر نکل گئے تھے ورنہ تمہیں فون کرنے میں اتنے دن نہ لگتے۔'' آنٹی نے کہا ''وہ تو میں نے بڑی مشکل سے تمہارا نمبر تلاش کیا۔ کئی دن سے کوشش کر رہی تھی۔''

اس روز عثمان کو احساس ہوا کہ بھائیوں کے برعکس شہناز بہت کم سخن ہے پھر پہلی بار اس نے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے جانے پر اس کا ردعمل بھی دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے حد واضح ناگواری تھی۔ عثمان کے

نزدیک وہ ردعمل فطری تھا۔ یوں دیکھے جانا کسی کو بھی اچھا نہیں لگ سکتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اس وارفتگی سے لڑنا ہوگا۔ اسے یوں دیکھنے سے گریز کرنا ہوگا۔

اس دن کے بعد عثمان کی جھجک نکل گئی۔ وہ باقاعدگی سے نجم صاحب کے گھر جانے لگا۔ ایک دن چھوڑ کر جانے کا معمول بن گیا تھا۔ کبھی دو دن کا وقفہ ہو جاتا تو اسے فون پر آنٹی کی ڈانٹ سننا پڑتی۔ شہناز کے سوا سب سے بے تکلفی ہوگئی تھی اب وہ اس کا...... گھر کے فرد کی طرح تھا۔

سب کچھ ہو گیا لیکن وہ شہناز سے بے تکلف نہیں ہوا۔ شہناز نے بھی کبھی رسمی باتوں کے سوا اس سے بات نہیں کی۔ اپنی گستاخ نگاہوں کے معاملے میں عثمان بہت محتاط ہو گیا تھا پھر بھی کبھی نگاہ اٹھ ہی جاتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ شہناز اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ ان نظروں کا مکمل مفہوم تو کبھی نہیں سمجھ سکا' اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ تولنے والی نظریں تھیں جیسے وہ اسے سمجھنے' اس کی اصل پیمائش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس کے دیکھنے پر بھی شہناز نے کبھی نظریں نہیں جھکائیں۔ الٹا وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی' جیسے اسے چیلنج کر رہی ہو۔ اس کے بعد اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی۔

عثمان نے کبھی اس چیلنج کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ محبت میں چیلنج کرنے کا قائل ہی نہیں تھا۔ وہ تو محبت کا طالب علم تھا۔ مبتدی' جس پر محبت کے اسرار ایک ایک کر کے کھل رہے...... اور اسے حیران کر رہے تھے جب محبت سے ناآشنا کوئی شخص پہلی بار کسی کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو ایک خاص عرصے تک اپنے آپ میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ محبت کے حوالے سے خود کو جاننے کی اور اپنے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ دوسروں' باہر کی دنیا کو بلکہ اپنے محبوب تک کو سمجھنے کی فرصت اس کے پاس نہیں ہوتی۔ اپنے اندر گم ہونے اور اس کیفیت کے عرصے کی طوالت کا انحصار اس کی محبت کی شدت' گہرائی اور سچائی پر ہوتا ہے۔ محبت جتنی شدید' گہری اور سچی ہوگی' یہ عرصہ اتنا ہی طویل ہوگا۔

عثمان بھی اس عرصے سے گزر رہا تھا۔ اس نے شہناز کے اس چیلنج کو دیکھا لیکن سمجھا نہیں بلکہ اس نے اسے سمجھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس نے تو بس اتنا دیکھا کہ شہناز اسے ٹٹولنے' تولنے والی نظروں سے دیکھتی ہے جب تک کوئی دلچسپی نہ ہو' کوئی کسی کو ایسے نہیں دیکھتا۔ یہ بات اس کیلئے بہت تھی کہ شہناز اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ مطمئن ہو گیا کہ اس کا جذبہ محبت یک طرفہ نہیں۔ اس کیلئے تو بس وہ نظر حوصلہ افزا تھی۔

پھر وہ اس عرصے سے گزر گیا جس میں اس کے اندر کی خوبصورتی اور وسعت نے اسے اسیر کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ خوبصورتی محبت کی عطا کی ہوئی ہے۔ وہ حیرت سے سوچتا' کیا محبت ایسا حسین' ایسا طاقتور اور ایسا بے کراں جذبہ ہے کہ آدمی کی دنیا ہی بدل کر رکھ دیتا ہے۔ پیتل کو سونا بنا دیتا ہے۔ اپنی تبدیلیاں اسے خود بھی بہت اچھی لگتی تھیں۔

اس عرصے سے گزرا تو باہر کی دنیا سے اس کا تعلق جڑا۔ اس نے دنیا کو اور دوسرے لوگوں کو دیکھنا شروع کیا پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے اندر موجود جھیل جیسی پرسکون اور خوبصورت محبت اپنا اظہار' اپنا اثبات چاہتی ہے اور وہ خود بھی اسے چھپا کر رکھنا نہیں چاہتا۔ یوں اس کیلئے ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ وہ یہ سب کچھ کیسے بتائے؟ ایک طرف وہ اس محبت کو بیان کرنا چاہتا تھا تو دوسری طرف اس کے اندر اس کے خلاف مزاحمت بھی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ محبت کو اور اس کی خوبصورتی کو وہ ٹھیک طور پر بیان نہیں کر سکے گا۔ بیان کے نتیجے میں محبت ہلکی اور گھٹیا ہو جائے گی۔ یہ اسے گوارا نہیں تھا۔

دل میں کوئی اچھی بات بھی بہت دن تک رہے تو بوجھ بن جاتی ہے۔ شیئر کرنا' وہ دکھ ہو یا سکھ' اچھی بات ہو یا خراب' انسان کی فطرت ہے۔ وہ خاموش اور ان کہی محبت عثمان کیلئے بوجھ بن گئی۔ مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ محبت بھی بڑھ رہی تھی اور بوجھ بھی۔ ایک وقت آیا کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس نے دل کا بوجھ کسی کے سامنے ہلکا نہیں کیا تو کسی دن وہ دھماکے سے پھٹ جائے گا۔

قدرتی طور پر اسے دل کا بوجھ شہناز کے سامنے ہلکا کرنا چاہیے تھا لیکن وہ اس کے سامنے اپنی محبت کو ہلکا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خواہش کے باوجود اس کے سامنے اس کی زبان نہیں کھلی۔ اس کے علاوہ ایک اور رکاوٹ بھی تھی۔ وہ صرف شہناز نہیں تھی' نجم انکل اور فہمیدہ آنٹی کی بیٹی بھی تھی۔ سعود اور محمود کی بہن بھی تھی۔ ان سب لوگوں نے اسے اعتماد اور محبت سے نوازا تھا۔ اسے اپنے گھر کے فرد کا درجہ دیا تھا۔ ایسے میں اسے زیب نہیں دیتا تھا کہ براہ راست شہناز سے اپنے دل کی بات کہے۔ یہ تو گھٹیا پن ہوتا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوتی کہ وہ انکل نجم سے یا آنٹی سے شہناز کو مانگ لیتا۔

جب یہ بوجھ ناقابل برداشت ہونے لگا تو اس نے اپنے بچپن کے دوست احسان سے سب کچھ کہہ دیا۔ احسان نے بہت توجہ سے اس کی بات سنی مگر زیر لب مسکراتا رہا۔ عثمان اس مسکراہٹ سے چڑ گیا

''یہ گدھے کی طرح اپنے ہونٹ کیوں پھیلائے جا رہے ہو؟''

''گدھا میں نہیں' تم ہو۔ مجھے کیوں سنا رہے ہو یہ کتھا۔'' احسان نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا ''بھائی۔ میرا نام شہناز نہیں ہے۔ نہ میں تمہارے اس اظہار محبت کا اہل ہوں' نہ ہی مستحق ہوں۔ میں تمہیں جواب میں وہ محبت بھی نہیں دے سکتا جو تمہیں ملنی چاہیے۔''

''ہر وقت مسخرا پن نہ کیا کرو۔'' عثمان نے اسے ڈپٹا ''میں شہناز سے یہ گفتگو نہیں کر سکتا۔''

''کیوں نہیں کر سکتے؟''

جواب میں عثمان نے اپنی وجوہات بیان کر دیں۔

احسان ہنسنے لگا ''تمہاری بات میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔ بھائی' تم اس سے گناہ کی بات تو نہیں کر رہے ہو کہ احساس جرم کا شکار ہو۔ یہ کوئی ناجائز کام تو نہیں۔''

''بس مجھے لگتا ہے کہ میں انکل اور آنٹی کے اعتماد کو مجروح کروں گا اس طرح۔''

"اپنی اوندھی منطق خود ہی جانو اور خود ہی بھگتو۔ میرے خیال میں تو شہناز سے بات کرنے میں کوئی برائی نہیں۔"

عثمان کے ذہن نے احسان کی بات درست تو تسلیم نہیں کی پھر بھی ایک ترغیب سی اس کے دل میں پیوست ہوگئی۔ اس کا فیصلہ اب بھی یہی تھا کہ اسے شہناز سے ایسی کوئی بات نہیں کرنی لیکن جب وہ شہناز کے قریب ہوتا تو ترغیب اسے کچھ کرنے' کچھ کہنے پر اکساتی۔

شہناز اب بھی اسے اسی طرح دیکھتی تھی۔ وہ نظریں اٹھاتا تو وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی۔ اس کی نگاہوں میں تمسخر اور چیلنج ہوتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر عثمان کے ہونٹ اس سے کچھ کہنے کیلئے مچلے۔ ہونٹ ہلے لیکن آواز نہیں نکلی۔

شہناز اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی "مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ؟" اس کے لہجے میں التجا سی تھی۔ اسے کچھ کہنے پر اکساتی ہوئی' بڑھاوا دیتی ہوئی التجا۔

ترغیب نے عثمان کے دل میں اس بے رحمی سے پنجے چبھوئے کہ وہ تلملا گیا۔ آخر کار فیصلہ کن لمحہ آ پہنچا تھا۔

☆☆☆☆☆

"یہ وہ ستون ہے' جس کے بل پر معاشرے کی عمارت کھڑے ہوتی ہے......" مسز شمیم ازدواجی زندگی کے متعلق کہہ رہی تھیں۔

"بھئی شہناز' سچی بات یہ ہے کہ تم بہت خوش نصیب ہو۔" بیگم سلیمان نے شہناز سے کہا "کیسی بھرپور اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری ہے تم نے......"

"یہ کیسے کہہ سکتی ہیں آپ؟" شہناز نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"بھئی تمہارا چہرہ' تمہارا جسم' تمہاری تازگی اور شادابی گواہی دیتی ہے۔ شادی کو پچیس سال ہو گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ نصف صدی پرانی تو ہو تم لیکن دیکھنے میں 32,30 سے زیادہ کی نہیں لگتیں۔ زیادہ سے زیادہ دو تین سال کی چھٹائی بڑائی ہوگی مجھ میں اور تم میں......"

چھٹائی بڑائی! شہناز نے دل میں بھنا کر سوچا۔ مطلب یہ کہ مجھ سے دو تین سال چھوٹی ہی ہوں گی بڑی بی......

"اور مجھے دیکھو۔ اپنی عمر سے کتنی بڑی لگتی ہوں۔ کاش ازدواجی زندگی کے معاملے میں' میں بھی تمہاری طرح خوش نصیب ہوتی۔"

"کاش' ایسا ہی ہوتا۔" شہناز نے جل کے کہا لیکن لہجہ ہمدردانہ رکھا۔ اندر ہی اندر وہ بڑی حقارت سے لفظ خوش نصیب کی گردان کر رہی تھی۔

یادوں کی ٹوٹی ہوئی فلم پھر سے جڑ گئی۔

عثمان حفیظ بڑے تواتر سے ان کے گھر آنے لگا تھا۔ اس کے انداز میں اب بلا کی خود اعتمادی تھی جیسے وہ اس گھر کا ہی فرد ہو۔ محمود اور مسعود اس کے گرویدہ تھے۔ ممی اور پاپا تو اس پر جان چھڑکتے تھے۔

دوسری طرف عثمان کا رویہ بھی اب پہلے سے مختلف ہوگیا تھا اب وہ پہلے کی طرح پاگلوں کے سے انداز میں ٹکٹکی باندھ کر اسے نہیں دیکھتا تھا شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ اس کی یہ حرکت اسے بجا طور پر ناگوار گزری ہے یہاں اسے پھر اس کی یہ کمزوری بری لگی۔ مردوں کو یوں ناگواری کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ مرد تو وہ ہے جو ڈٹا رہے کسی عورت کی آرزو کرے تو اسے حاصل کیے بغیر چین سے نہ بیٹھے۔ اس نے سوچا۔ یہ شخص ہے ہی کمزور۔ اس کی شخصیت میں بودا پن ہے۔

شہناز دودھ پیتی بچی نہیں تھی پھر مشکور کی محبت نے بھی اس کی سمجھ داری میں اضافہ کیا تھا۔ مردوں کی نظروں کے معاملے میں عورتوں کو ویسے بھی فطری شعور ہوتا ہے۔ معصوم بچیاں تک مردوں کی نظروں کو پہچان لیتی ہیں۔ شہناز نے بھی عثمان کی والہانہ نظریں' اس کی وارفتگی دیکھی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ یہی نہیں' اسے اس کی محبت کی شدت کا بھی اندازہ ہوگیا تھا جس شخص کو کسی لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس بات کا خیال بھی نہ رہے کہ اسے اس عالم میں جو بھی دیکھے گا اس کے راز کو جان جائے گا' وہ اپنے آپ میں ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر شہناز نے ممی اور پاپا کی عثمان سے محبت بھی دیکھی تھی۔ وہ جس طرح سے اس پر جان چھڑکتے تھے' وہ خطرناک تھا۔ جوان بیٹی کے ماں باپ اگر کسی جوان آدمی پر والہ وشیدا ہوں تو اس کا صرف ایک سبب ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس جوان کو اپنا بیٹا بنانا چاہتے ہیں۔ اپنی بیٹی کا مستقبل اس سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں داماد کی محبت بیٹے سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اسے اولاد کی طرح چاہنے لگتے ہیں۔

شہناز کو احساس ہوگیا کہ یہ معاملہ خطرناک ہے۔ عثمان حفیظ خود بھی خطرناک آدمی تھا۔ اس کی خطرناکی اس کی اہلیتوں میں پنہاں تھی۔ اسے معقولیت کے ساتھ مسترد کرنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن تھا۔ معاشی اعتبار سے وہ مستحکم تھا۔ محنتی بھی تھا اور کاروباری شعور بھی رکھتا تھا۔ صورت شکل اور شخصیت کے اعتبار سے لاکھوں میں ایک تھا۔ خوش گفتار بھی تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کردار کے اعتبار سے بھی وہ بے داغ ہے۔ ایسے آدمی کو کوئی کیسے مسترد کرسکتا ہے۔

شہناز ذہین تھی۔ اس دشواری کو خوب سمجھتی تھی اگر مشکور اسے پہلے نہ مل گیا ہوتا تو وہ خود بھی ہچکچائے بغیر عثمان کو قبول کرلیتی لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا وہ صورتحال کو اور زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ بات اگر رشتے کی حد تک پہنچ جاتی تو معاملہ مشکل ہوجاتا اور بات وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ عثمان کم ہمت اور بزدل تھا۔ وہ چاہتا تھا لیکن اس کے روبرو اظہار محبت کی اسے جرات نہیں ہوتی تھی مگر وہ اس کے پاپا اور ممی سے تو کسی بھی وقت بات کرسکتا تھا۔ عافیت اس میں تھی کہ اس سے پہلے ہی معاملے کو نمٹا دیا جائے۔

شہناز کو عثمان پر غصہ آنے لگا اگر وہ صحیح معنوں میں مرد ہوتا تو اس سے اظہار محبت کیے بغیر نہ رہتا اور اظہار محبت کرتا تو شہناز کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ وہ بڑی صفائی سے اسے بتا دیتی کہ یہ ممکن نہیں۔ یہ خیال اسے دل سے نکالنا ہوگا۔ اس کے بعد وہ ممی یا پاپا سے رشتہ کی بات نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ ایسا تھا ہی نہیں چنانچہ شہناز ہی کو کچھ کرنا تھا۔

بہت غور فکر کے بعد شہناز نے ایک لائحہ عمل ترتیب دے لیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ عثمان کو اکسائے گی۔ ایک تبدیلی تو عثمان میں آئی تھی۔ وہ اب اسے مسلسل وارفتگی سے نہیں تکتا تھا۔ ایسا ہوتا تو شہناز کو اسے جھاڑنے کا ایک بہانہ مل جاتا اب شہناز نے خود ہی کام سنبھال لیا۔ وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی اور اندر ہی اندر حکمیہ لہجے میں کہتی رہتی۔ مجھے دیکھو...... ادھر دیکھو...... میری طرف دیکھو۔

نظروں کی چبھن کا تو اسے تجربہ تھا۔ کوئی ٹکٹکی باندھ کر دیکھے تو دیکھے جانے والے کو احساس ہو کر رہتا ہے بلکہ فوراً ہوتا ہے۔ عثمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ احساس ہو جانے پر وہ نظریں اٹھا کر دیکھتا تو شہناز کو گھورتے پاتا۔ اس شہ پر وہ بھی اسے دیکھنا شروع کرتا تو وہ نظریں جھکانے کے بجائے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگتی۔ بغیر لفظوں کے وہ اپنے وجود کی پوری شدت سے کہنا شروع کرتی۔ ہمت ہے تو مجھ سے بات کرو۔ مجھ سے اظہار محبت کرو۔ کہو مجھ سے' کیا کہنا چاہتے ہو لیکن عثمان نے اس کا چیلنج بھی قبول نہیں کیا۔ چند لمحوں میں ہی وہ نظریں جھکا لیتا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے' شہناز مایوس ہوگئی۔

ایک دن عثمان نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو خلاف معمول اس کے ہونٹوں میں لرزش نظر آئی۔ شہناز کا دل بری طرح دھڑکنے لگا شاید اس کی مشکل آسان ہونے والی تھی۔ وہ متوقع نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ عثمان کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن آواز کوئی نہیں تھی۔

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا یہ لمحے بھی یونہی گزر جائیں گے؟ اسے کچھ کرنا چاہیے ''مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ؟'' اس نے بے ساختہ کہا۔ اس کے لہجے میں اپیل تھی۔ التجا تھی۔

عثمان چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بہت دھیرے سے بولا۔ ''نہیں' کچھ بھی نہیں۔ میں کیا کہوں گا۔''

اس روز شہناز بالکل ہی مایوس ہوگئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ یہ معاملہ اس انداز میں سامنے آئے گا' جس سے وہ بچنا چاہ رہی ہے تو اب اسے کچھ اور کرنا ہوگا اور بہت تیزی سے کرنا ہوگا۔ بلی کے تھیلی سے باہر آنے سے پہلے!

اگلے روز وہ مشکور سے ملی تو اس سلسلے میں اس سے بات کی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ عثمان کی بات آنے سے پہلے ہمارا معاملہ چل نکلے۔''

''تو میں اس سلسلے میں کیا کروں؟'' مشکور نے پوچھا ''اپنی امی کو تمہارے گھر بھیجوں؟''

''نہیں' ابھی نہیں۔ پہلے میں اپنی ممی سے بات کرلوں۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری امی کو انکار کی توہین کا سامنا کرنا پڑے۔''

''تو کیا انکار بھی ہو سکتا ہے؟'' مشکور کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ تم اپنی جاب تو دیکھو۔''

''کیا برائی ہے میری جاب میں؟ اور میں یہاں رکنے والا بھی نہیں۔ مجھے بہت آگے جانا ہے تم دیکھ لینا......''

''یہ تو میں پچھلے چار سال سے سن رہی ہوں۔ میں اپنے پاپا کو خوب جانتی ہوں۔ تمہاری یہ جاب ہمارا کام مشکل کر دے گی۔''

''تو کیا میری شخصیت' میری ذہانت کی کوئی حیثیت نہیں'' مشکور آپے سے باہر ہونے لگا۔

''یہ بات نہیں......''

''یہی بات ہے میں سمجھ رہا ہوں۔ مجھے کوئی پروا بھی نہیں۔ بات نہیں بنتی تو نہ بنے۔''

شہناز اسے فخر اور محبت سے دیکھتی رہی۔ اس کی یہی مردانہ کوالٹی اسے بھائی تھی۔ اسے منانے' رام کرنے میں خاصی دیر لگی۔

شہناز نے اس سلسلے میں اپنی ممی سے بات کی۔ ممی نے پاپا کو بتایا تو پاپا پریشان ہو گئے ''یہ کیسی خبر لے آئیں فہمیدہ۔'' انہوں نے کہا۔

''کیوں...... کیا بات ہے؟ آپ پریشان کیوں ہو گئے؟''

''آپ یہ بتائیں کہ عثمان کیسا لڑکا ہے؟'' پاپا نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

''عثمان تو مثالی لڑکا ہے۔ سچ پوچھیں' مجھے تو بہت ہی پسند ہے لیکن اس وقت اس کا تذکرہ کہاں سے نکال لیا آپ نے؟'' ممی کے لہجے میں حیرت تھی۔

دروازے کی اوٹ میں کھڑی ان کی گفتگو سنتی ہوئی شہناز نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس نے جان لیا کہ اب ممی کا ووٹ بھی اس کا نہیں رہے گا۔

''میں تم سے بات کرنے ہی والا تھا۔ عثمان نے مجھ سے شہناز کیلئے بات کی ہے۔''

فہمیدہ بیگم کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی ''کمال ہے۔ میں نے کبھی اسے شہناز میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔''

''شرافت یہی ہوتی ہے۔'' نجم الحسن بولے ''بات جس انداز میں ہونی چاہیے' اس نے اسی انداز میں کی ہے لیکن یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا۔ تم کہتی ہو کہ شہناز......''

''آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں شہناز سے بات کروں گی۔''

ممی نے شہناز سے بات کی۔ شہناز اپنی بات پر ڈٹی رہی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ عثمان تو اسے بالکل اچھا نہیں لگتا اور وہ مشکور کے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گی۔

فہمیدہ بیگم نے نجم الحسن کو بتایا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ مشکور سے مل لینا چاہیے۔ دیکھا تو جائے کہ لڑکا کیسا ہے مگر ان کا فیصلہ تھا کہ پہلے مرحلے میں وہ صرف مشکور سے ملیں گے۔ شہناز کیلئے یہ بات بھی توقع سے بڑھ کر تھی۔

☆☆☆☆☆

مسز شمیم کی تقریر جاری تھی لیکن عثمان حفیظ اپنے ماضی میں کھویا ہوا تھا۔

نجم صاحب سے بات کرنے کے بعد وہ بے حد ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ اس نے شہناز سے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن بات جس انداز میں جہاں پہنچنی چاہیے تھی' وہاں پہنچا دی تھی۔ نجم صاحب نے اس کی بات خاموشی سے سنی تھی لیکن کہا کچھ بھی نہیں تھا۔ عثمان بھی اپنی بات کہنے کے بعد وہاں سے چلا آیا تھا۔

اگلے روز نجم صاحب نے شام کے وقت اسے فون کیا'' بیٹے' تم مائنڈ نہ کرنا کہ کل میں نے تمہیں جواب نہیں دیا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں انکل۔''

''میرا جواب تو تم جانتے ہو؟''

عثمان کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں' جانتا ہوں کہ احتیاطاً اسے اپنی خوش گمانی پر محمول کر رہا ہوں۔''

''یہ خوش گمانی نہیں اگر فیصلہ صرف میرا ہوتا تو میں کل ہی تمہیں جواب دے دیتا لیکن یہ معاملہ براہ راست شہناز کی زندگی کا ہے پھر مجھے تمہاری آنٹی سے بھی مشورہ کرنا ہے۔ پہلے موقع دیکھ کر میں ان سے بات کروں گا پھر وہ شہناز سے بات کر لیں گی۔''

''میں سمجھ رہا ہوں انکل۔''

''بیٹے' کچھ دن لگیں گے۔''

''میں انتظار کروں گا انکل.....

''اور یہ بات کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم گھر آنا چھوڑ دو۔ تم پہلے کی طرح ہمارے ہاں آتے رہو گے۔ مجھے یقین ہے کہ فیصلہ تمہارے حق میں ہی ہو گا۔''

''شکریہ انکل۔'' ریسیور رکھنے کے بعد عثمان نے آنکھیں موندلیں۔ اس کی آنکھوں میں سپنے اتر آئے تھے۔

☆☆☆☆☆

معاملات شہناز کی توقع سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے آگے بڑھے تھے۔

اس روز عثمان نہیں آیا تھا۔ شہناز کیلئے یہ بات باعث تشویش تھی کہ وہ اب بھی معمول کے مطابق

گھر آ رہا تھا اور اس کے انداز میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ جس مزاج اور طبیعت کا آدمی تھا' شہناز کو توقع تھی کہ وہ اب ان کے گھر نہیں آئے گا۔ شرمیلے لوگوں کا ردعمل تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

پھر ایک اور بات تھی۔ شہناز نے اپنی مرضی دوٹوک لفظوں میں بتادی تھی اور پاپا نے اسے مسترد بھی نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پہلے وہ صرف مشکور سے ملیں گے۔ اس صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ انہوں نے عثمان کی حوصلہ افزائی کی ہو مگر عثمان پھر بھی معمول کے مطابق آ رہا تھا۔ عام طور پر وہ ایک دن چھوڑ کر آتا تھا۔ وہ سلسلہ اب بھی اسی طرح چل رہا تھا۔

شہناز بہت پریشان تھی۔ اسے لگتا تھا کہ پاپا نے یا پھر ممی نے عثمان کو یقیناً کوئی یقین دہانی کرائی ہے اسی لیے اس کا طرز عمل بالکل نارمل ہے اور اگر کوئی یقین دہانی کرائی گئی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مشکور کے سلسلے میں پہلے ہی سے کوئی منفی فیصلہ کر لیا گیا ہے۔

اس روز عثمان نہیں آیا تھا۔ کھانے کی میز پر صرف گھر کے لوگ تھے۔ محمود اور سعود تو کھانا کھا کر جلد ہی اٹھ گئے پھر پاپا بھی اٹھ گئے۔ اپنے کمرے کی طرف جانے سے پہلے انہوں نے اس سے کہا'' نازو بیٹی' ابھی تمہیں کوئی کام ہے؟''

''جی پاپا۔ برتن سمیٹنے ہیں۔''

''کام نمٹا کر اوپر میرے کمرے میں آ جانا۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

شہناز کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ ''جی پاپا۔''

بیس منٹ بعد وہ پاپا کے کمرے کے دروازے پر پہنچی تو آوازوں سے اندازہ ہوا کہ ممی پہلے ہی سے وہاں موجود ہیں'' میری پوزیشن بے حد نازک ہے فہمیدہ بیگم۔'' پاپا کہہ رہے تھے'' چھان بین کرنا میرا فرض ہے۔ دشواری یہ ہے کہ نازو مجھے غیر جانبدار تسلیم نہیں کرے گی۔''

''آپ اس کے باپ ہیں۔ یہی نہیں' آپ اس سے محبت بھی بہت کرتے ہیں۔ ممی نے کہا'' وہ جانتی ہے کہ آپ اس کا برا نہیں چاہیں گے بلکہ اس کیلئے بہتر سے بہتر کی خواہش کریں گے۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ آپ کی غیر جانبداری پر شک کرنے کی حماقت کرے گی۔''

''تم نہیں جانتیں فہمیدہ بیگم۔ جوان خون میں جب جذباتیت کا ابال آئے تو وہ کچھ نہیں سوچتا سمجھتا۔ کم از کم اس وقت نہیں۔ سمجھ بعد میں آتی ہے۔ جب دیر ہو چکی ہوتی ہے۔''

''مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اسے سچ جھوٹ اور برا بھلا بتائیں بھی نہیں۔ وہ ہماری ذمے داری ہے۔''

شہناز کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس گفتگو سے اس کے اندیشوں کی تائید ہو رہی تھی۔ کوئی فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔

''جی پاپا'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

''بیٹی' پہلے میں جاننا چاہوں گا کہ مجھے اپنا ہی خواہ سمجھتی ہو یا نہیں؟''

شہناز جانتی تھی کہ کیا بات سامنے آنے والی ہے۔ اس نے کہا'' پاپا میرا ایمان ہے کہ آپ میرے بھلے کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے۔''

''تو تمہیں اعتماد ہے کہ میں تمہارے متعلق جو بھی فیصلہ کروں گا وہ درست ہوگا۔''

''یہ دو مختلف باتیں ہیں پاپا۔ فیصلے کا درست ہونا یا آپ کے نکتہ نظر سے میرے حق میں بہتر ہونا۔'' شہناز نے بے حد رسان سے کہا۔

''گویا تمہیں اس سلسلے میں مجھ پر اعتماد نہیں؟'' پاپا کے لہجے میں اداسی تھی۔

''یہ بات نہیں پاپا۔ آپ دنیاوی نکتہ نظر سے میرے لیے بہتر سوچ سکتے ہیں۔'' اس نے اعتبار سے کہا۔'' لیکن آپ یہ تو نہیں سمجھ سکتے کہ باطنی طور پر میری پسند ناپسند' میری ترجیحات اور میری ضرورتیں کیا ہیں۔ اس معاملے میں آپ کا فیصلہ ضروری نہیں کہ درست ہو اس لیے کہ آپ میں نہیں ہیں۔ آپ شہناز نہیں۔''

پاپا کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی'' بہر کیف۔ تم کچھ بھی سمجھو۔ مجھے تو اپنا فرض انجام دینا ہے۔ میں اس لڑکے مشکور سے مل چکا ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ مجھے وہ اچھا نہیں لگا۔ وہ کسی اعتبار سے بھی تمہارے لائق نہیں۔''

''مجھے بھی یہ سن کر افسوس ہوا پاپا لیکن کیا کروں' وہ میری پسند ہے اور پسند کا اختلاف کوئی بڑا اور اہم مسئلہ نہیں ہوتا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے پاپا کہ کوئی زیور خریدتے وقت میری پسند آپ کی پسند کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ زیور میرے لیے خریدا جا رہا ہے۔''

پاپا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس کا انداز' اس کے الفاظ یقیناً ان کیلئے شاک کا باعث بنے تھے پھر انہوں نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا'' تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی مگر زیور کی حد تک۔ زیور اور شوہر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ زیور جب جی چاہے' بدلا جا سکتا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں شوہر اتنی آسانی سے نہیں بدلا جا سکتا۔''

شہناز ایک لمحے کو گنگ ہوگئی۔ پاپا نے اس کی بات پکڑ کر بے حد منطقی دلیل دی تھی لیکن بہر حال وہ بھی انہی کی بیٹی تھی'' پاپا' میں نے آج تک جو بھی چیز پسند کی وہ میرے دل سے کبھی نہیں اتری۔ میں بہت سوچ سمجھ کر کچھ پسند کرتی ہوں۔'' وہ کہتے کہتے رکی'' آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو مشکور کس بنا پر ناپسند ہوا۔ اس میں کیا خامیاں نظر آئیں آپ کو۔''

''اس بات کی کیا اہمیت ہے جبکہ تم کو میری ناپسندیدگی کی کوئی پرواہی نہیں۔''

''خیر' مشکور کو ناپسند کرنے والے کیلئے اس کی وجوہات بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں۔'' شہناز نے بے حد اعتماد سے کہا۔'' آپ نے بڑی صفائی سے دامن بچا لیا لیکن میں جانتی ہوں مشکور کو ناپسند کرنے کی وجہ مشکور کا کوئی عیب یا برائی نہیں۔ آپ کی ایک پسند ہے۔ عثمان حفیظ!''

''دیکھا تم نے۔ میں نے کہا تھا نا۔'' پاپا نے ممی سے کہا پھر وہ اس کی طرف مڑے'' ناز' تم نے زیادتی کی۔ مجھے بدنیتی تک ٹھہرا دیا لیکن میں تم پر غصہ نہیں کروں گا میں تمہارا باپ ہوں۔ اس توہین کو پی جاؤں گا البتہ میں تمہیں اس کی خامیاں ضرور بتاؤں گا۔ تمہیں سمجھاؤں گا کہ وہ مجھے کیوں پسند نہیں آیا مگر میں اس سے پہلے تم سے ضرور پوچھوں گا کہ تمہیں وہ کن خوبیوں کی بنا پر پسند ہے۔''

چند لمحے خاموشی رہی۔ شہناز کیلئے پاپا کا ردعمل بالکل غیر متوقع تھا۔ چند لمحے تو اس کے ذہن نے کام ہی نہیں کیا۔ اس کے بعد اس نے مشکور کی خوبیاں یاد کرنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے'' وہ وجیہہ ہے۔ اس کی شخصیت پرکشش ہے۔ اسے اپنے اوپر بلا کا اعتماد ہے۔ وہ مضبوط آدمی ہے' پرعزم اور محنتی۔ وہ ایسا ہے جیسا کسی مرد کو ہونا چاہیے۔'' وہ کہتے کہتے رکی اسے احساس ہوا کہ وہ کھوکھلی باتیں کر رہی ہے تو پاپا کو کیا قائل کرے گی'' بس پاپا' سب سے بڑی بات یہ کہ وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

''اب تم خود سوچو کہ تم نے کتنی خوبیاں بیان کیں اس کی۔'' پاپا نے تمسخرانہ لہجے میں کہا'' وہ وجیہہ ہے۔ یہ کوئی خوبی نہیں' اس کی شخصیت پرکشش ہے یہ صرف تمہارے دل کی بات ہے۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اسے پسند نہیں کرتے۔ اسے اپنے اوپر بلا کا اعتماد ہے۔ یہ بھی کوئی خوبی نہیں۔ خود اعتمادی معقول حد تک ہو تو خوبی ہے' ضرورت سے زیادہ ہو تو یا تو وہ شخص بے وقوف کہلاتا ہے یا پھر منافق ہوتا ہے۔ وہ مضبوط آدمی ہے۔ یہ محض تمہارا حسن ظن ہے۔ وہ پرعزم اور محنتی ہے یہ بھی غلط ہے۔ اب یہ تم بیٹھ کر سوچو کہ کیا کسی مرد کو ایسا ہونا چاہیے؟''

شہناز چڑ گئی'' آپ صرف اسے رد کرنا چاہتے ہیں۔ عثمان کی خاطر۔''

''عثمان کو بیچ میں مت لاؤ شہناز'' ممی نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم بیچ میں مت بولو فہمیدہ بیگم۔ یہ اتنا اہم معاملہ ہے۔ ہمیں نازو کی ہر بات سننا ہوگی۔'' پاپا نے ممی کو ٹوک دیا اور اس کی طرف مڑے'' دیکھو بیٹی' میں تین دن پہلے اس سے ملا اور میں نے پہلی ہی نظر میں اسے ناپسند کیا۔ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ اپنی طویل کاروباری زندگی میں ہزاروں انسانوں سے واسطہ پڑا ہے۔ ہزاروں انسانوں کو برتا ہے میں نے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا پہلا تاثر کبھی غلط نہیں ہوتا لیکن......''

''آپ اسے صرف اس لیے مسترد کر رہے ہیں کہ وہ مالی اعتبار سے آپ کا ہم پلہ نہیں۔ آپ کا

خیال ہے کہ وہ مجھے آسائشات فراہم نہیں کر سکے گا لیکن پاپا مجھے آسائشات کی کوئی طلب بھی نہیں۔"

"تم نے خواہ مخواہ میری بات کاٹی۔" پاپا نے متاسفانہ لہجے میں کہا "اور تم بدگمانی بھی بہت کرتی ہو۔ پوچھو اپنی ممی سے کہ مجھ سے ان کی شادی ہوئی تو میرے پاس کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ میرا تو ایمان ہے کہ دولت بیوی اور بچوں کے نصیب سے ملتی ہے۔ میں تو اپنے داماد کو صرف اچھا انسان دیکھنا چاہتا ہوں۔ دولت کی مجھے ضرورت نہیں۔ دولت میرے پاس بہت ہے۔"

"شہناز، ہم نے وہ وقت بھی گزارا ہے کہ تمہارے لیے ایک وقت کے دودھ کا بندوبست کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا" ممی نے کہا۔ "پھر محمود کی پیدائش کے بعد ایک دم دن پھر گئے ہمارے۔"

"میں تمہیں کچھ بتا رہا تھا نازو۔ بات وہیں سے شروع کرتا ہوں" پاپا نے کہا "مجھے اپنی مردم شناسی پر بھی اعتماد ہے اور اپنی غیر جانبداری اور سچائی پر بھی۔ مشکور کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ وہ کوئی اچھا انسان نہیں۔ جیسا ظاہر کرتا ہے درحقیقت ویسا نہیں۔ مجھے یقین تھا اس پر لیکن میں نے یقین نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ انسان کتنا پیچیدہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے خود پر اعتماد نہیں کیا۔ میں عثمان کو پسند کرتا ہوں، بہت زیادہ۔ وہ بیٹوں کی طرح عزیز ہے مجھے۔ میں نے سوچا، ممکن ہے میں اسی کی خاطر لاشعوری طور پر مشکور میں عیب نکال کر اسے مسترد کر رہا ہوں۔ اس لیے میں نے اس کے متعلق چھان بین کرائی اور یقین کرو، مشکور میرے خدشات سے بڑھ کر برا ثابت ہوا۔ اس کے دوست تک متفق ہیں کہ وہ مطلبی اور خود غرض ہے۔ اس کے باس کا کہنا ہے کہ وہ ہڈ حرام ہے اور محنت کرنا نہیں جانتا۔ صرف اپنے باپ کی وجہ سے اسے ملازمت ملی ہوئی ہے۔ وہ ریٹائر ہو گئے تو اسے کوئی پوچھے گا بھی نہیں اور سنو، وہ جھوٹا ہے۔ اس کے والد کوئی گزیٹڈ آفیسر نہیں، محض کلرک ہیں۔ ان کی اتنی اہمیت صرف اس لیے ہے کہ وہ ایسی جگہ کام کرتے ہیں جہاں کاروباری لوگوں کو ان سے کام پڑتے رہتے ہیں۔ خود مشکور میں کوئی ایسی خوبی اور اہلیت نہیں جس کی وجہ سے وہ اچھے مستقبل کی آس لگائے۔ اس پر ستم یہ کہ موصوف کو جوئے اور شراب کے علاوہ ایک ایسی لت بھی ہے جس کا میں تمہارے سامنے تذکرہ نہیں کر سکتا۔ ان لتوں کی وجہ سے وہ ہمیشہ مقروض رہتا ہے۔ بس باتیں کرنے کا فن اسے خوب آتا ہے جس کی وجہ سے وہ تم جیسی لڑکیوں کو بھی لبھا لیتا ہے اور لوگوں سے قرض لینے میں بھی کامیاب رہتا ہے۔ یہ ہے تمہارا مشکور احمد۔ اب تم اپنے ذہن میں قائم اس کی خوبیوں کا موازنہ ان مصدقہ برائیوں سے کر کے خود ہی فیصلہ کر لو۔ جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ سب کا سب تصدیق شدہ ہے۔"

"میں ایسی کسی بات پر یقین نہیں کر سکتی۔" شہناز نے کہا "میں اسے کالج کے زمانے سے جانتی ہوں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔"

"یہ بھی میں نے تمہاری ممی کو بتا دیا تھا۔" پاپا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہ بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں بتا چکی ہوں۔"

"دیکھو بیٹا، میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں شادی کے معاملے میں زبردستی کا قائل بھی نہیں۔ ویسے بھی یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے خلاف ہے لیکن تمہیں دیدہ و دانستہ تباہی کی طرف کیسے دھکیل سکتا ہوں۔ پلیز میری بات مان جاؤ۔ میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے، لفظ بہ لفظ سچ ہے۔"

"سوری پاپا میرا فیصلہ اب بھی وہی ہے۔"

اچانک پاپا کے چہرے پر سختی کا تاثر ابھرا "مجھے افسوس ہے کہ تم نے معقولیت کا ثبوت نہیں دیا۔ میں تمہاری ضد کے مقابلے میں ضد کر کے تمہیں کوئی غلط قدم اٹھانے کا موقع نہیں دوں گا کہ یوں میری جگ ہنسائی ہو گی۔ میں تمہاری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دوں گا۔ میں باپ کی طرح تمہیں اس گھر سے وداع کروں گا لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ مشکور سے شادی کے بعد تمہارا مجھ سے، اپنی ممی اور بھائیوں سے...... اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ ہم تمہیں رخصت پوری عزت اور شان سے کریں گے لیکن ہمیشہ کیلئے۔"

ایک لمحے کو شہناز تھرا کر رہ گئی پھر وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ پاپا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"نہیں شہناز۔" وہ نازو بیٹی کے بجائے اسے شہناز کہہ کر مخاطب کر رہے تھے "ابھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ چاہے تمہیں ضرورت نہ ہو، پھر بھی میں تمہیں تین دن کی مہلت دوں گا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ نہ سوچنا چاہو تب بھی اپنا فیصلہ تین دن بعد سنانا اور وہ بھی اپنی ممی کو۔ یہ یاد رکھنا کہ میرا فیصلہ بھی اٹل ہے۔ بس اب تم جاؤ۔ میری دعا ہے کہ خدا تمہیں عقل کی روشنی عطا فرمائے۔"

شہناز کمرے سے نکلی تو دل گرفتہ ضرور تھی لیکن وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کیلئے بھی آمادہ نہیں تھی۔ مشکور کی محبت سے پیچھے ہٹنے کی اب گنجائش نہیں تھی۔

وہ سمجھی تھی کہ اب گھر کے ماحول میں کشیدگی رچ جائے گی لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اگلے روز شام کے وقت عثمان آ گیا۔ پاپا بھی موجود تھے۔ چائے لان پر ہی پی گئی۔ خوب قہقہے لگے۔ سبھی خوش مزاجی کے موڈ میں تھے۔ عثمان بھی چہک رہا تھا البتہ اسے یوں نظرانداز کر رہا تھا جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔

اگلے تین دن ممی اسے سمجھانے کی مسلسل کوشش کرتی رہیں۔ آخر جھنجلا گئیں "جہنم میں جاؤ۔" انہوں نے غصے میں کہا۔ "مقدر سے بھلا کوئی لڑ سکتا ہے۔"

تیسری دن ممی نے اس سے آخری بار پوچھا کہ اس کا فیصلہ کیا ہے "میری پسند اور میرے فیصلے آسانی سے نہیں بدلتے ممی...... میں شادی مشکور ہی سے کروں گی۔" اس نے جواب دیا۔ ممی اس کا فیصلہ پاپا کو سنانے چلی گئیں۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ واپس آئیں تو ان کی آنکھوں میں نمی تھی "شہناز، مشکور کو بتا دو کہ اس کے گھر والے جب چاہیں، رشتے کیلئے آ سکتے ہیں۔" انہوں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

شہناز نے مشکور کو فون کر کے اگلے روز کی ملاقات طے کر لی۔

اگلے روز وہ مقررہ وقت پر دلکشا ریسٹورنٹ پہنچ گئی۔ مشکور بیس منٹ کی تاخیر سے آیا اور جب وہ آیا تو وہ اسے دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ اس کا ہاتھ Sling میں تھا۔ چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور وہ بے حد کمزور لگ رہا تھا۔ وہ قریب آیا تو اس کے کندھے کے قریب بازو پر پٹی بندھی نظر آئی۔

وہ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی ''کیا بات ہے مشکور؟ یہ کیا ہوا؟'' اس کے لہجے میں وحشت تھی۔

مشکور نے مسکرانے کی کوشش کی ''کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ بیٹھ جاؤ سکون سے مجھے تماشا مت بناؤ۔''

وہ دونوں بیٹھ گئے ''تم بتاتے کیوں نہیں مجھے۔''

''بتادوں گا۔ ذرا سانس تو لینے دو۔ کافی منگواؤ میرے لیے۔ کریم کے ساتھ۔''

شہناز نے ویٹر کو بلا کر آرڈر نوٹ کرایا اور پریشانی سے مشکور کو دیکھتی رہی جس نے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ شہناز نے اسے چھیڑا نہیں۔ جانتی تھی کہ ایسے میں مداخلت اسے بالکل پسند نہیں۔

ویٹر کافی لے آیا تھا۔ شہناز نے کافی بنائی اور پیالی اس کے سامنے کھسکا دی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ شہناز کو ان میں ویرانی سی نظر آئی۔

''اب تو بتادو کہ کیا ہوا ہے۔'' شہناز نے التجا کی۔

''کچھ نہیں۔ معمولی سی بات ہے۔ کسی نے گولی چلائی تھی مجھ پر۔'' مشکور نے بے پروائی سے کہا۔

''گولی؟'' شہناز کی آنکھیں پھیل گئیں ''کب کی بات ہے؟''

''دو دن ہو گئے۔ پرسوں صبح کی بات ہے یہ۔''

''زخم کہاں......''

''بائیں بازو میں۔ گولی گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ ہڈی محفوظ ہے۔''

''خدا کا شکر ہے۔ خطرے کی تو کوئی بات نہیں؟''

''خطرہ فی الحال ٹل گیا۔'' وہ ہنسنے لگا ''نشانہ خطا ہو گیا اناڑی کا۔ گولی دل سے خاصی دور لگی۔ پورے سوا دو انچ دور۔ اسی لیے یہاں بیٹھا نظر آ رہا ہوں۔''

شہناز نے محبوبیت سے اسے دیکھا۔ اب ایسے جری مرد سے کوئی پیار نہ کرے تو کیا کرے ''کچھ اندازہ ہے کہ حملہ آور کون تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''اس سے کیا کیا فرق پڑتا ہے۔'' کندھے جھٹکنے کی کوشش میں اس کے منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی اور چہرے پر جیسے زردی کھنڈ گئی۔ ''آج کل ہر چیز کرائے پر مل جاتی ہے۔ ریوالور بھی اور حملہ آور بھی۔'' اس نے اپنی بات پوری کی۔

''کیا مطلب؟''

''ہر بات کا مطلب نہیں پوچھتے۔ مردوں کی باتیں مردوں کیلئے ہی رہنے دو۔'' مشکور نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''تم اپنی سناؤ۔''

شہناز خوش ہو گئی ''میں تو خوشخبری لے کر آئی ہوں۔'' اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ ''اب تم اپنے گھر والوں کو کل ہی بھیج دو ہمارے ہاں۔ میں نے پاپا سے بات کر لی ہے۔''

مشکور نے کافی کی پیالی اٹھائی اور آخری گھونٹ لے کر خالی پیالی میز پر رکھ دی۔ ''سوری بے بی۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''یہ تو اب ممکن نہیں۔''

شہناز بھونچکی رہ گئی ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میرے گھر والے تمہارے ہاں رشتہ مانگنے نہیں آ سکتے۔ نہ ہی میں تم سے شادی کر سکتا ہوں۔''

''کیوں آخر؟''

''وجہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔''

''یہ میرا حق ہے۔ وجہ تو تمہیں بتانا ہو گی۔'' شہناز نے تند لہجے میں کہا۔ فوراً ہی اس کا لہجہ نرم ہو گیا' ورنہ کہہ دو کہ تم مذاق کر رہے ہو۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں اور تمہیں وجہ بھی نہیں بتا سکتا۔ اس لیے کہ جانتا ہوں' عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں اور تمہارے منہ سے کبھی یہ بات نکل گئی تو میں اس خطرے سے دوچار ہو جاؤں گا' اس سے پہلے میں تم سے دست بردار ہو رہا ہوں۔ میں اتنا بڑا خطرہ نہیں لے سکتا۔''

شہناز کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اتنی مشکل سے تو یہ بات بنی تھی۔ اس شادی کیلئے کیا کیا کچھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اب مشکور ہی انکاری ہو رہا تھا اور اسے وجہ بھی نہیں معلوم ہو گی۔ نہیں...... وجہ جاننا تو بہت ضروری ہے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ مشکور کے انکار کی وجہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا تعلق ضرور ہے ''پلیز مشکور' مجھے سب کچھ بتادو۔'' وہ گڑگڑائی ''میں وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ ساری زندگی راز رکھوں گی اسے۔''

مشکور سوچ میں پڑ گیا ''یہ تمہارے لئے غیر ضروری بوجھ ہو گا۔ میں تمہیں کرب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔''

''یقین کرو۔ اتنا ظرف رکھتی ہوں میں۔''

''تو میری قسم کھاؤ کہ یہ راز ہمیشہ راز رہے گا۔ تمہاری زبان کھلی تو مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔''

’’میں تمہاری قسم کھاتی ہوں کہ تمہارا یہ راز کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا۔‘‘

’’سوچ لو۔ضبط کرنا بہت دشوار ہوگا۔‘‘

’’سوچنے کی تو اب بات ہی نہیں۔تمہاری قسم کھا چکی ہوں میں۔‘‘

’’قاتلانہ حملے سے پہلے مجھے فون پر دھمکی دی گئی تھی کہ میں تمہارا خیال دل سے نکال دوں۔‘‘مشکور نے کہا’’میں نے اسے اہمیت نہیں دی۔ایک گھنٹے بعد مجھ پر گولی چلا دی گئی۔‘‘

شہناز نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا’’اور تم موت سے ڈر گئے۔موت کے خوف سے تم مجھے چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔‘‘

’’بکواس مت کرو ورنہ تھپڑ مار بیٹھوں گا میں......‘‘

’’تم بات ہی ایسی کر رہے ہو۔‘‘

’’پوری بات سنو میری اور زبان بند رکھو تھوڑی دیر۔‘‘مشکور نے سخت لہجے میں کہا’’اگلے روز پھر فون موصول ہوا۔اس بار دھمکی کی نوعیت بدل گئی۔مجھ سے کہا گیا کہ میری تین بہنیں ہیں۔وہ اغوا بھی ہو سکتی ہیں اور ان کی بے عزتی بھی کچھ مشکل نہیں پھر میرے ماں باپ کی باری آئے گی اور آخر میں میرا نمبر آئے گا۔اس پر میں نے کہا کہ جب تم میں زندہ ہوں‘ یہ کچھ نہیں ہو سکتا۔فون کرنے والے نے بے نیازی سے کہا کہ میں نے بات نہیں مانی تو یہ بھی دکھا دیا جائے گا۔‘‘اس نے چند لمحے توقف کیا’’اب بتاؤ میں کیا کر سکتا تھا۔ سوائے اس کی بات ماننے کے۔گولی چلا کے وہ معاملے کی سنگینی کا ثبوت دے چکا تھا۔‘‘

شہناز کو چپ سی لگ گئی۔یہ سب کچھ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہے تو کیا کہے۔

’’اس نے یہ تنبیہہ کی تھی کہ میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتاؤں ورنہ ہر دھمکی پر عمل کیا جائے گا۔مجھ سے کہا گیا کہ بس تمہارا خیال دل سے نکال دوں۔‘‘وہ کہتے کہتے رکا’’میں مرد آدمی ہوں موت سے نہیں ڈرتا لیکن بہنوں کا معاملہ تو نہیں سہہ سکتا۔اسی لیے تمہیں نہیں بتانا چاہ رہا تھا۔اسے اندازہ ہو گیا کہ تمہیں یہ بات معلوم ہو گئی تو......‘‘وہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔

شہناز کو اس پر ترس آنے لگا۔ایسا مضبوط اور جواں مرد کیسا خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ساتھ ہی اس کا خون بھی کھولنے لگا۔

’’چار دن پہلے میں نے پاپا کو بتا دیا تھا کہ میں تمہارے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔‘‘شہناز نے بتایا’’انہوں نے مجھے تین دن کی مہلت دی تھی کہ میں خوب سوچ سمجھ کر حتمی فیصلہ کر لوں۔کل میں نے انہیں بتا دیا۔انہوں نے کہا کہ میں تمہارے گھر والوں کو رشتہ طلب کرنے کیلئے بلا سکتی ہوں۔‘‘

’’اس یقین کے ساتھ کہ میرے گھر سے رشتہ مانگنے کیلئے کوئی نہیں آئے گا۔‘‘مشکور نے زہریلے لہجے میں کہا۔

شہناز کو اس کی بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔اس کی تیوریاں چڑھ گئیں’’کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہ قاتلانہ حملہ میرے پاپا نے کرایا ہے اور وہی تمہیں دھمکیاں دے رہے ہیں۔‘‘

’’میں کچھ بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔یہ تو دو جمع دو چار والی بات ہے۔میرے ہتھیار ڈالنے کے بعد ہی انہوں نے حامی بھر لی ہے۔‘‘

’’تم غلط سمجھ رہے ہو۔پاپا نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس شادی کے خلاف ہیں۔انہوں نے کہا کہ وہ باقاعدہ مجھے رخصت کریں گے لیکن ہمیشہ کیلئے۔تم سے شادی کے بعد میرا اس گھر سے‘ان سے‘ممی اور بھائیوں سے کوئی تعلق نہیں رہے گا اگر یہ سب کچھ ان کا کیا دھرا ہوتا تو انہیں یہ دھمکی دینے کی کیا ضرورت تھی۔‘‘

’’تم ٹھیک کہہ رہی ہو مجھے ان پر شک تھا بھی نہیں۔‘‘مشکور نے کہا’’لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ کس کی حرکت ہے۔‘‘

’’میں بھی سمجھ رہی ہوں۔‘‘شہناز نے کہا’’یہ عثمان کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا لیکن مشکور‘تم اس کا دماغ تو بہ آسانی درست کر سکتے ہو۔‘‘

’’میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے بے بی۔میری بہنیں میرے پاؤں کی بیڑیاں بن گئی ہیں۔‘‘

’’تو پھر؟‘‘

’’تم مجھے بھول جاؤ اور خدا کیلئے اپنا وعدہ یاد رکھنا۔دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس طرح وہ میرا اور تمہارا تعلق ختم کر سکے گا۔‘‘

’’یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔‘‘

گھر آ کر شہناز سوچتی اور الجھتی رہی۔بساط کیسے الٹ گئی تھی۔جس خواب کی تعبیر کیلئے وہ ممی اور پاپا کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوئی تھی‘جس کیلئے وہ سب کچھ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئی تھی وہ بس خواب ہی رہ گیا تھا۔تعبیر اب اسے کبھی نہیں مل سکتی تھی۔اسے عثمان سے ایسی نفرت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا بس چلتا تو وہ اس کی بوٹیاں نوچ لیتی۔

وہ سوچتی اور اسے غصہ آنے لگتا۔پاپا نے مشکور کو خود غرض اور مطلبی کہا تھا اور مشکور نے اپنی بہنوں کی خاطر کیسا ایثار کیا تھا۔اپنی محبت سے‘اپنے ہر خواب سے دستبردار ہو گیا تھا اور جس عثمان پر وہ جان چھڑک رہے تھے وہ خود غرض ثابت ہوا تھا۔اسے اپنانے کیلئے‘اس کی محبت حاصل کرنے کیلئے وہ کیسے ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا اور پاپا کہتے ہیں کہ وہ مردم شناس ہیں۔انسانوں کو پہچانتے ہیں۔ہزاروں انسانوں کو برتا ہے انہوں نے۔

’’کب آ رہے ہیں وہ لوگ؟‘‘ممی نے اسے چونکا دیا۔

"وہ لوگ نہیں آئیں گے۔" شہناز نے جواب دیا۔ وہ اپنا لائحہ عمل ترتیب دے چکی تھی" پاپا نے ٹھیک کہا تھا مشکور اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس نے شادی سے انکار کر دیا۔"

ممی سے اپنی خوشی نہیں چھپائی گئی" او...... تو اس لیے اداس بیٹھی ہو۔ کوئی بات نہیں۔ رشتوں کی کوئی کمی تو نہیں تمہارے لیے۔"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے ممی۔ میں عثمان سے شادی کروں گی۔"

"لیکن تم اسے پسند نہیں کرتیں۔"

"وہ ناپسندیدگی تو اس لیے تھی کہ میں مشکور کو پسند کرتی تھی۔" شہناز نے کہا" اور ویسے بھی میں آپ کو اور پاپا کو خوش کرنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی تھی۔"

ممی خوش ہو گئیں۔ وہ جانتی تھی کہ ان کی وساطت سے یہ بات پاپا تک پہنچے گی تو وہ بھی بہت خوش ہوں گے۔

اس رات وہ دیر تک جاگتی رہی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ کسی محبت سے دستبردار ہونا بیحد مشکل کام ہے۔ کتنی بار اس کے جی میں آئی کہ سب کچھ چھوڑ کر مشکور کے پاس چلی جائے۔ اس سے کہے کہ ہم سب کچھ چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔ اپنی دنیا کہیں اور بسائیں لیکن وہ جانتی تھی کہ اب یہ ممکن نہیں۔ بہنوں کا مسئلہ اپنی جگہ ہے، وہ نہ بھی ہوتا تب بھی مشکور نے جو کہہ دیا تھا وہ اس سے کبھی نہ ہٹتا۔ جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔

اسے مشکور کا اٹھایا ہوا سوال یاد آیا۔ کیا اس طرح وہ ان کے تعلق کو ختم کر سکے گا؟ کبھی نہیں۔ وہ بڑبڑائی۔ اس سوال کا جواب سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔ اس رات اس نے جتنے خواب دیکھے وہ محبت اور انتقام کے ملے جلے خواب تھے۔

☆☆☆☆☆

عثمان بہت خوش تھا۔ اس کے خوابوں کو تعبیر مل گئی تھی!

اس روز رات کے کھانے کے بعد نجم صاحب اسے اپنی اسٹڈی میں لے گئے۔ آنٹی کافی وہیں لے آئیں" بیٹھ جاؤ فہمیدہ بیگم۔ تمہاری موجودگی بھی ضروری ہے۔" نجم صاحب نے کہا۔

آنٹی مسکراتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

عثمان کا چہرہ تمتمانے لگا۔ انکل اور آنٹی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ اسے لگتا تھا کوئی اہم بات ہونے والی ہے۔

"ویسے تو تم میرے لیے اولاد کی طرح ہو۔" نجم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا" لیکن ہم نے تمہیں باقاعدہ اپنا بیٹا بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" عثمان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"یہ گھر کی بات ہے لیکن بہتر ہو گا کہ تم اپنے چند رشتے داروں کو ہمارے ہاں بھیج دو تا کہ تاریخ وغیرہ طے کر لی جائے۔"

"میرے رشتے داروں سے تو آپ خوب واقف ہیں انکل۔" عثمان نے آہستہ سے کہا" وہ تو یہیں چاہیں گے کہ یہ رشتہ ختم ہو جائے۔ اس میں ان کا اپنا مفاد ہے۔"

نجم صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔" کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔"

"تو یہ کون سا بڑا مسئلہ ہے۔" فہمیدہ آنٹی بولیں۔" آپ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ یہ گھر کی بات ہے۔ عثمان میرے لیے بھی بیٹوں کی طرح ہے۔"

"مطلب؟" نجم صاحب نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ شہناز کے باپ ہیں اور میں عثمان کی ماں۔ یوں ہم خود طے کر لیں گے۔"

نجم صاحب کی آنکھیں چمکنے لگیں" ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" وہ عثمان کی طرف مڑے" تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ تو آپ کا احسان ہے مجھ پر۔" عثمان نے ممنونیت سے کہا۔

"فضول باتیں مت کرو۔"

"ٹھیک ہے انکل۔ اب میں چلتا ہوں۔"

اگلے روز عثمان نے اپنی فرم کے منیجر ساجد صاحب سے بات کی۔ وہ سب سے پرانے آدمی تھے اور ابو سے بہت قریب رہے تھے۔" آپ بے فکر رہیں عثمان میاں۔" انہوں نے کہا" تمام انتظامات ہو جائیں گے۔ آپ صرف تاریخ بتا دیجیے گا۔ میں اور دفتر کے سب لوگ ہر طرح سے حاضر ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم سب مرحوم صاحب سے اور آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔"

عثمان جانتا تھا۔ اس کا عملی مظاہرہ وہ ابو کے انتقال کے موقع پر دیکھ چکا تھا۔ اس نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ ابو نے ساری زندگی اصل کمائی کیا کی ہے۔

تین دن بعد نجم صاحب نے فون کیا۔" تم آئے نہیں۔ تین دن سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔" انہوں نے چھوٹتے ہی شکایت کی۔

"بس انکل، اب تو مشکل ہے۔ اچھا نہیں لگتا ہے۔"

"ہم جانتے تھے کہ یہی ہو گا۔" نجم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔" اس لیے تمہاری امی نے اصرار کیا کہ تاریخ دور کی نہ رکھی جائے۔ انہوں نے اس مسئلے پر شہناز کے ابو سے خوب لڑائی کی۔"

عثمان اس دلچسپ گفتگو پر مسکراتا رہا" تو پھر کیا طے پایا؟"

"آج 15 دسمبر ہے نا۔ بس تمہارے پاس 16 دن کی مہلت ہے۔ یکم جنوری کو شادی طے پا گئی ہے۔ باقی تفصیل تمہاری امی خود گھر آ کر تمہیں بتائیں گی۔ اب میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔"

''شکریہ انکل۔''

''اور کوئی مسئلہ ہو کوئی کام ہو جس میں دشواری ہو تو مجھے فون کر دینا۔ ٹھیک ہے بیٹے؟''

''جی انکل۔''

اگلے روز سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ عثمان کے اصرار پر ساجد صاحب کی بیوی اور بچے اس کے گھر آ گئے۔ عثمان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ گھر میں اتنی رونق بھی ہو سکتی ہے۔ شادی چیز ہی ایسی ہے۔ گھر کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔

دن تیزی سے اڑتے رہے۔ سال رواں ختم ہوا اور نیا سال آ پہنچا۔ سال نو کا پہلا دن...... شادی کا دن، خوابوں کی تعبیر کا دن!

سب مہمان رخصت ہو گئے۔ ساجد صاحب اور ان کے گھر والوں کو اس نے اصرار کر کے چند روز کیلئے روک لیا تھا۔ رات گئے وہ حجلہ عروسی میں داخل ہوا تو اس کی دھڑکنیں تیز رفتاری کے نئے ریکارڈ قائم کر رہی تھیں۔ وہ اس کی سہاگ رات تھی۔ ارمانوں بھری سہاگ رات!

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ آراستہ چھت بے حد حسین لگ رہی تھی...... کچے گلابوں کی سیج نے پورے کمرے کو مہکا دیا تھا۔

مگر کمرے میں کوئی کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مسہری کی طرف بڑھا اور سیج کی لڑیاں ہٹا کر دیکھا۔ اس کی دلہن سیج پر موجود نہیں تھی۔ ارے...... یہ کہاں گئی۔ چند لمحے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ملحقہ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور شہناز اندر آئی۔

وہ حیرت سے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسے زبردست شاک لگا تھا۔

شہناز سفید کاٹن کے عام سے لباس میں تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے پاک تھا۔ بھیگے ہوئے بالوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نہا کر نکلی ہے۔ اس کا دھلا دھلایا چہرہ بے حد تروتازہ لگ رہا تھا۔ صرف بالوں میں کہیں کہیں چمکی افشاں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ دلہن بنی ہوگی۔

عثمان گنگ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس سادہ لباس میں بھی وہ ہمیشہ سے کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی لیکن اس کا شاک اپنی جگہ تھا۔ وہ دولہا تھا، جو اپنی سجی سنوری دلہن کو دیکھنے کا شوق لیے کمرے میں گیا تھا۔ اس کی شیروانی کی جیب میں منہ دکھائی کا تحفہ موجود تھا لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ تو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا۔

''کیا بات ہے؟ آپ رک کیوں گئے؟'' شہناز کی آواز نے جیسے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

''یہ...... یہ...... سب کیا ہے؟'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

شہناز نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا ''کیا؟ آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہاری طرف۔'' عثمان کے لہجے میں شکایت تھی۔

''کیوں...... مجھے کیا ہو گیا؟'' شہناز نے معصومیت سے کہا۔

''یہ تم نے اپنا کیا حلیہ بنا لیا؟'' اس کے لہجے کی شکایت اور گہری ہو گئی۔

''اچھی نہیں لگ رہی ہوں کیا؟'' شہناز نے بڑے ناز سے پوچھا۔

''بہت اچھی لگ رہی ہو۔ تم تو ہر حال میں اچھی لگتی ہو۔'' عثمان نے بے حد نرم لہجے میں کہا مگر پھر اس کے لہجے میں شکایت در آئی ''لیکن یہ ہماری سہاگ رات ہے۔ تم میرے لیے دلہن بنی تھیں۔ میرے لیے سجی سنوری تھیں اور اب......''

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' شہناز نے اٹھلاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی ''سوری عثمان، دراصل مجھے گرمی بہت لگ رہی تھی۔ ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔''

اس موسم میں گرمی! نئے سال کے پہلے دن گرمی! عثمان کو کچھ ہونے لگا۔ وہ خود بھی اپنی کیفیت نہیں سمجھ رہا تھا۔ اسے غصہ بھی تھا، جھنجھلاہٹ بھی تھی اور افسوس بھی ہو رہا تھا شاید اسے یہ احساس بھی ستا رہا تھا کہ جو کچھ ہو گیا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔ جو کچھ کھو گیا ہے اب اسے کبھی نہیں مل سکتا۔ یہ لمحے تو کبھی پلٹ کر نہیں آئیں گے ''تم تھوڑی دیر انتظار کر سکتی تھیں پھر گرمی کیسی۔ مجھے اس شیروانی میں بھی گرمی نہیں لگ رہی ہے۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''شادی کا جوڑا بہت بھاری ہوتا ہے پھر اتنا زیادہ میک اپ۔ میں اس کی عادی نہیں ہوں'' شہناز نے کہا۔ عثمان کہنا چاہتا تھا کہ عادی تو کوئی لڑکی بھی نہیں ہوتی لیکن اس سے کہا نہیں گیا۔ درحقیقت وہ ابھی تک شاک سے نہیں نکلا تھا۔

''اور مجھے گرمی ویسے بھی بہت زیادہ لگتی ہے۔''

عثمان تھکے تھکے قدموں سے مسہری کی طرف بڑھا اور بیٹھ گیا۔ ''اب تم نہا چکی ہو۔ پھر سے دلہن بن جاؤ۔ صرف چند منٹ کیلئے سہی۔ میری خاطر...... پلیز'' اس نے التجا کی۔

''وہ میک اپ تو میں قیامت تک نہیں کر سکتی۔ مجھے میک اپ کرنا آتا ہی نہیں۔ کبھی کیا ہی نہیں میں نے۔'' شہناز نے عذر پیش کیا ''اور سنیں۔ میں روایت شکن لڑکی ہوں۔ میرے خیال میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہاں آپ کی خاطر شادی کی پہلی سالگرہ پر میں یہ اہتمام کروں گی۔ سہاگ کا جوڑا بھی پہنوں گی مگر آج نہیں۔''

عثمان کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے تمام سپنے بکھر گئے ہیں۔ خوشیوں میں جیسے کوئی کرب گھل مل گیا ہے۔ اس کے ذہن میں تو سہاگ رات کا کچھ اور ہی تصور تھا۔ وہ مسہری پر بیٹھے گا جہاں وہ پہلے ہی سے سمٹی، گٹھڑی بنی بیٹھی ہوگی۔ وہ اس کا گھونگھٹ اٹھائے گا اور

اس کا حجاب اس کی سانسیں روک دے گا۔ وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہے گا...... دیر تک۔ وہ کھنکارے گی تو وہ چونکے گا پھر وہ اسے منہ دکھائی کا تحفہ دے گا اور پھر......

شہناز بے تکلفی سے مسہری پر بیٹھ گئی اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگالی۔

یہاں نہ وہ دلہنوں والا حجاب تھا نہ سہاگ رات کا وہ افسانوی حسن۔ وہ کسی سنگین مگر حسین حقیقت کی طرح اس کے روبرو تھی۔

''اچھا اب میری منہ دکھائی نکالیں۔'' شہناز نے بے تکلفی سے کہا۔

وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم روایت شکن ہو کر ایسا روایتی مطالبہ کر رہی ہو لیکن وہ تلخی نہیں بڑھانا چاہتا تھا پھر بھی اس نے کہا ''جس طرح منہ دکھایا جاتا ہے اس طرح تو تم نے دکھایا ہی نہیں۔ منہ دکھائی کیا دوں تمہیں؟''

''کیوں بھئی؟ منہ تو دیکھا ہی ہے آپ نے۔'' وہ اٹھلائی۔

''یہ منہ تو بہت پہلے دیکھا تھا۔ اسی وقت لے لیتیں۔ منہ دکھائی۔'' عثمان کو احساس ہوا کہ اس نے بہت سخت بات کہہ دی ہے۔ صورتحال کچھ بھی ہو لیکن وہ بہر حال شہناز کو روح کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ وہ اسے کیسے تکلیف پہنچا سکتا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا ''یہ تو خیر مذاق تھا۔ یہ لو اپنی منہ دکھائی۔'' اس نے شیروانی کی جیب سے رسٹ واچ کا کیس نکالا۔ اس میں سے گھڑی نکالنے کے بعد اس نے شہناز کی کلائی تھامی اور اس پر گھڑی باندھ دی۔

''منہ دکھائی میں یہ عام سی گھڑی۔'' شہناز نے بے ساختہ کہا۔

عثمان کے چہرے کی رنگت ایک لمحے کو متغیر ہوگئی۔ ''یہ عام سی گھڑی نہیں ہے۔ یہ تمہیں پتا چل جائے گا۔'' شہناز کی کلائی اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگا لیا۔ ''شہناز' آئی لو یو۔'' اس کی آواز بدلنے لگی۔ لہجے میں محبت ہی محبت تھی ''میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اس کا بیان ممکن نہیں۔ بتایا ہی نہیں جاسکتا۔ بس یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔''

''میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ یہ میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری ہے۔'' شہناز نے کہا۔

''ادھر آؤ۔ اس نے شہناز کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا'' میں تمہیں ایک اور چیز دکھانا چاہتا ہوں۔''

وہ اسے مسہری کے پیچھے بائیں جانب والے گوشے کی طرف لے گیا وہاں چھت سے فرش تک ایک مخملی پردہ لہرا رہا تھا ''اس ڈوری کو کھینچ کر پردہ کھولو۔'' اس نے کہا۔

شہناز نے ڈوری کھینچی۔ پردہ دونوں طرف سمٹنے لگا۔ پردہ ہٹا تو ایک اور حریری پردہ سامنے آیا۔ عثمان شہناز کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ حریری پردے کے پیچھے کارنس پر رکھی چیز دیکھ کر شہناز مبہوت ہو کر رہ گئی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی سانسیں رک گئی ہیں ''کیسا ہے؟'' عثمان نے پوچھا۔

''بہت حسین۔'' شہناز نے جواب دیا وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ بلور کا بے حد حسین تاج محل تھا۔ اس نے حریری پردہ بھی ہٹا دیا۔

''یہ میری محبت کی علامت ہے۔'' عثمان نے کہا۔ ''میں بادشاہ ہوتا تو سچ مچ تاج محل تعمیر کراتا تمہارے لیے۔''

شہناز نے سر اٹھا کر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

''اس کی اصل خوبصورتی اب دیکھنا۔'' عثمان نے کہا اور سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بٹن دبائے اور کمرے میں اندھیرا اچھل گیا ''کیا کر رہے ہیں؟'' اندھیرے میں شہناز کا احتجاج ابھرا۔

عثمان نے ایک سوئچ دبایا اور بلور کا تاج محل روشن ہوگیا۔ تاج محل کے اس ماڈل کے اندر بہت چھوٹے چھوٹے قمقمے تھے لیکن روشنی بہت زیادہ نہیں تھی ''اسے اس کمرے کا نائٹ بلب سمجھ لو۔ کیسا لگا تمہیں؟''

''اچھا ہے۔'' اس بار شہناز کے لہجے میں بے نیازی تھی۔

عثمان نے دونوں ہاتھ شہناز کے کندھوں پر رکھے تو اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ وہ اسے مسہری کی طرف لے چلا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے وجود کے اندھیرے میں سمٹ کر بیٹھا سردی سے تھر تھرا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کیا انسان برف کی مورت بھی ہوتا ہے؟ وہ سوچ رہا تھا۔ گداز' حرارت اور جنبش سے محروم؟ وہ اپنے وجود کی تمام حرارت گنوا کر بھی برف کی مورت میں حرارت کی رمق تک منتقل نہیں کر سکا تھا۔

کیا سہاگ رات ایسی ہوتی ہے؟ اس نے سوچا۔ اسے احساس جرم ستانے لگا۔ وہ تو بہت خود غرض' بہت کم ظرف ثابت ہوا تھا۔ سوائے شرمندگی کے اس نے کیا کمایا تھا۔ محبت کوئی یک طرفہ جذبہ تو نہیں ہوتا۔ اس کیلئے سونا بھی دشوار ہوگیا۔ اس نے پہلو کی طرف دیکھا۔ شہناز بے سدھ سو رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

شہناز بہت آہستگی سے عالم خواب سے عالم ہوش میں آئی۔ اس سفر میں ایک احساس اس کا ہم سفر تھا اور جب اس نے عالم ہوش میں قدم رکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ محض احساس نہیں تھا بلکہ آواز تھی جو بیداری کے عالم میں بھی اس کے ساتھ تھی۔ کوئی بے حد رومانوی سرگوشی میں دہرائے جا رہا تھا' آئی لو یو' آئی لو یو' آئی لو یو......''

شہناز نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ سجی ہوئی چھت دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ سہاگ رات کے بعد جاگی ہے۔ وہ رومانوی سرگوشی اب بھی اس کی سماعت میں گدگدی کر رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ عثمان کی آواز ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ اس کے ہونٹ ساکت تھے۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔

اس کا ذہن جو ابھی تک پوری طرح نہیں جاگا تھا' خوف زدہ ہو گیا۔ یہ آواز کیسی ہے۔ کہاں سے آ رہی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیران نظروں سے ادھر ادھر دیکھے جا رہی تھی۔ آواز اس کے بہت قریب سے اس کے اندر سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

اچانک اسے اپنی کلائی کے مرتعش ہونے کا احساس ہوا۔ اس کلائی پر منہ دکھائی والی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے اس ہاتھ کو اوپر...... اپنے چہرے کے قریب لائی۔ آواز زیادہ بلند ہو گئی۔ زیادہ صاف سنائی دینے لگی۔ اس نے گھڑی کو کان سے لگایا اور جان لیا کہ آواز گھڑی میں آ رہی ہے۔ اس نے بوکھلا کر گھڑی کو ٹٹولا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی کئی چابیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے تمام چابیوں کو دبا کر دیکھ لیا۔ آواز بند نہیں ہوئی۔ وہ جھنجھلا گئی۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ گھڑی نے جیسے اس کی آواز سن لی۔ اظہار محبت کا وہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔

اس نے برابر میں سوئے عثمان کو دیکھا۔ اس وقت وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے اس پر پیار آنے لگا مگر فوراً ہی ردعمل کے طور پر خود پر غصہ آیا۔ اس سے اسے انکار نہیں تھا کہ وہ بہت پرکشش آدمی ہے یہ بات اس نے بہت پہلے تسلیم کر لی تھی کہ اگر مشکور درمیان میں نہ ہوتا تو وہ عثمان سے محبت کیے بغیر نہ رہتی۔

وہ اسے غور سے دیکھتی رہی اور اس کے اندر متضاد جذبوں کی جنگ ہوتی رہی اگر اس کی شادی عام حالات میں ہوئی ہوتی تو وہ اس کی ظاہری شخصیت کی کشش سے نہیں بچ سکتی تھی لیکن شادی سے پہلے ہی اس کا اصل روپ اس کے سامنے آ چکا تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے اپنی خواہش کیلئے راستہ صاف کیا تھا۔ شہناز کے نزدیک بے رحمی میں کوئی برائی نہیں تھی۔ مرد کو اپنے اہم معاملات میں بے رحم ہونا چاہیئے۔ سختی اور سخت گیری مرد پر سجتی ہے لیکن عثمان نے مشکور کو راستے سے ہٹانے کیلئے جو کچھ کیا تھا وہ مردانگی کے خلاف تھا۔ وہ ایسی چھپی ہوئی' بزدلی میں لپٹی ہوئی سفاکی تھی جو صرف عورتوں میں ہوتی ہے۔

تو اب اس سے محبت کو دل چاہے یا اس پر پیار آئے' وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

وہ اٹھی۔ وارڈ روب سے اپنے لیے ایک سادہ سا لباس نکالا اور باتھ روم چلی گئی۔

باتھ ٹب کے نیم گرم پانی میں دراز ہو کر بھی وہ عثمان ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ کیسے تضادات ہیں اس شخص میں۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اس کے پاس غضب کا Imagination ہے۔ ذوق بھی ہے۔ یہ کسی کی بھی محبت جیت سکتا ہے۔ اسے محبت بھی ہوئی تو ایسی لڑکی سے' جو پہلے ہی کسی اور کی محبت میں گرفتار تھی۔ اصولاً اسے دل جیتنے کی' اپنے حریف کو محبت کے میدان میں شکست دینے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ اس میں اس کی صلاحیت بھی ہے۔ تمام ہتھیار موجود ہیں اس کے پاس لیکن اس نے کیا کیا...... گھٹیا پن کا مظاہرہ۔ اپنی دولت اور کرائے کی طاقت پر گھمنڈ! اس شخص کو محبت جیتنی بھی نہیں آتی۔ وہ اپنے Imagination اپنے ذوق سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔

لیکن شادی کی رات وہ مختلف آدمی تھا۔ اس کا وہ جگمگاتا تاج محل دیکھ کر چند لمحوں کیلئے وہ بے خود ہو گئی تھی۔ اس نے خود کو پگھلتا محسوس کیا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اس کی بانہوں میں اس کے سینے پر بکھر جائے لیکن فوراً ہی اسے اس کی اصلیت یاد آ گئی۔ وہ سحر فوراً ٹوٹ گیا۔

اور اب یہ گھڑی! یہ رومانوی سرگوشی۔ آئی لو یو۔ یہ اظہار محبت اور اظہار محبت کرنے والے کی ایسی قربت کہ وہ ہر وقت کلائی سے لپٹا رہے۔ کون ہے جو ایسی محبت کی ناقدری کر سکتا ہے۔ اس سے منہ موڑ سکتا ہے۔ صرف وہی جو خوبصورت ظاہر کے پردے میں چھپے بھیانک اور گھناؤنے باطن کو دیکھ چکا ہو۔

شہناز کے ذہن میں اس لمحے اس بے حد مشکل سوال نے سر اٹھایا اگر عثمان نے یہ تحفے شادی سے پہلے دیئے ہوتے تو کیا ہوتا؟ کیا وہ مشکور کی محبت سے چمٹی رہتی؟ یا عثمان کے اس منفرد اظہار محبت کے سامنے سر جھکا دیتی؟

سوال بے حد مشکل تھا مگر اس کے ذہن میں جو جواب ابھر رہا تھا۔ وہ کمزور کر دینے والا تھا۔ اب ایسی باتوں کا کیا فائدہ؟ ایسا ہوا تو نہیں نا۔ اس نے جھنجھلا کر سوچا۔ وقت اب پلٹ تو نہیں سکتا اس لیے یہ سوال مہمل ہے۔ اس کا جواب غیر ضروری ہے۔

نہیں عثمان حفیظ۔ وہ بڑبڑائی۔ میں تم سے محبت نہیں کر سکتی۔ تم بزدل اور کم ظرف ہو۔ تم مرد ہو لیکن مردانگی سے محروم۔ جو کچھ تم نے کیا' اس کی سزا تمہیں دنیا کا کوئی مرد نہیں دے سکتا۔ ہاں عورت دے سکتی ہے اور دے گی۔ میں نے تم سے شادی ہی اس لیے کی ہے۔ میں تمہاری زندگی کو جہنم بنا دوں گی۔ میں تمہیں بتاؤں گی کہ تم میں کتنا ہی عورت پن ہو' تم سفاکی میں عورت کی ہم سری نہیں کر سکتے۔ تم کتنی ہی...... کیسی ہی محبت کر لو مجھ سے' تم مجھے جیت نہیں سکتے عثمان حفیظ۔

وہ باتھ روم سے باہر آئی تو وہ بیدار ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

ایک ماہ میں عثمان کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی ازدواجی زندگی شرمندگی کی تحریر بن گئی ہے۔

وہ پریشان رہنے لگا۔ شادی تو خوشی کا نام ہے۔ مسرت لاتی ہے اور ازدواجی زندگی میں ایک آدمی کے خوش اور مطمئن ہونے سے کام نہیں چلتا۔ کچھ خوشیاں تو مشروط ہی اس سے ہوتی ہیں کہ دونوں فریق مطمئن ہوں لیکن وہ پوری کوشش کے باوجود خوشی حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔

شہناز اس کیلئے ایک ناقابل تسخیر برفانی چوٹی بن گئی تھی۔ وہ ایک ایسا کوہ پیما تھا' جو پیہم کوشش کے باوجود اسے سر نہیں کر پا رہا تھا اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اونچے پہاڑوں کو سر کرنے کی مہمات ناکام کیسے ہوتی ہیں اور ان کی کامیابی کی کیا وجوہات ہوتی ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ پہاڑ تسخیر ہونے پر آمادہ ہو۔ پہاڑوں کا رویہ معاندانہ ہو تو بات نہیں بنتی۔ مہم کو ادھورا چھوڑنا پڑتا ہے اور اگر کوہ پیما ضد کریں تو جان سے ہاتھ بھی دھو بیٹھتے ہیں۔ دوسری چیز موسم ہے۔ مہم کی کامیابی کیلئے موسم کا سازگار ہونا اشد

ضروری ہے۔ ناسازگار موسم میں بھی پہاڑی چوٹیاں سر نہیں ہوتیں۔ اسے یاد آیا کہ دشوار ترین پہاڑی چوٹیاں وہی ہوتی ہیں جہاں موسم سارا سال ہی خراب رہتا ہے۔ جہاں موسم کا مزاج کبھی نہیں ملتا۔ موسم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ سازگار موسم چند منٹ بھی رہ سکتا ہے اور چند گھنٹے بھی اور پل کے پل میں سب کچھ بدل کے رہ جاتا ہے۔

وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا لیکن پوری طرح نہیں سمجھ رہا تھا لیکن یہ سب کچھ یونہی تو نہیں چل سکتا۔ اسے احساس ہو گیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس سلسلے میں شہناز سے بات کرنا پڑے گی چنانچہ اس رات اس نے شہناز سے یہ موضوع چھیڑ دیا ''تم خوش نہیں ہو شہناز۔''

''نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔'' شہناز نے جواب دیا۔

''مجھے تو تم خوش اور مطمئن نہیں لگتیں۔''

''یہ تو پھر آپ ہی جانتے ہوں گے۔'' شہناز کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''میں آپ کی ذمے داری ہوں۔''

عثمان کا احساس جرم اور بڑھ گیا ''وہ تو میں سمجھ رہا ہوں لیکن اس مسئلے کو حل بھی تو کرنا ہو گا۔ کوئی حل تو ہو گا اس کا۔''

''ہونا تو چاہیے۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ تم میری مدد کر سکتی ہو۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم مجھے تعاون نہیں کرتیں۔ تم میرے ساتھ شامل نہیں ہوتیں۔''

''میں اس سے انکار نہیں کروں گی لیکن اس میں میرا قصور نہیں۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایسے دو افراد کا تصور کریں جو ٹیبل ٹینس کھیل رہے ہیں اور ان میں سے ایک ایسا ہے جو کھیلنا نہیں چاہ رہا ہے مگر دوسرے کی خاطر ہاتھ میں ریکٹ لیے کھڑا ہے ایسی صورت میں کیا ہو گا۔''

عثمان کی سمجھ میں بات پوری طرح آ گئی ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس صورت میں کھیل نہیں ہونا چاہیے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں نے تمہارے اندر کبھی آمادگی محسوس نہیں کی۔ تم ہمیشہ مجھے برف کی مورت کے روپ میں ملیں۔''

''یہ محض اتفاق ہے۔'' شہناز نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ویسے میں ہر تعاون کیلئے تیار ہوں اور تعاون بھی کرتی رہی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آپ کو کبھی روکا نہیں۔''

عثمان چند لمحے سوچتا رہا ''حالانکہ تعاون یہ ہوتا کہ تم مجھے روک دیتیں۔ ناآسودگی کا کچھ فائدہ نہیں۔ آسودگی تو خود مجھے بھی نہیں ملتی۔''

''میں ہمیشہ یہ سوچتی رہی کہ اس میں آپ کی دل آزاری ہو گی۔''

''اس انداز میں مت سوچو۔ تم مجھے روک سکتی ہو۔ یہ تمہارا حق ہے اور دوسری طرف تم مطالبہ کرنے کا حق بھی رکھتی ہو۔'' عثمان نے کہا۔ ''اور ہاں ایک اور تعاون بھی تم مجھ سے کر سکتی ہو۔''

''آپ بتائیں۔''

''وہ یہ کہ جب تمہارے ہاں آمادگی ہو تو مجھے بتا دو۔''

شہناز نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا ''یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ یہ تو بے شرمی ہو گی۔''

''پلیز...... میری خاطر۔'' عثمان نے التجا کی ''اور پھر منہ سے کہنا ضروری تو نہیں، اظہار کے اور بھی طریقے ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔''

عثمان اس گفتگو کے بعد مطمئن ہو گیا لیکن وہ طمانیت بھی عارضی ہی ثابت ہوئی۔ اب وہ بس یہی کہہ سکتا تھا کہ شاید ان دونوں کے ستارے نہیں مل رہے ہیں۔ منفی انداز میں وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ جب وہ بے حد تھکا ہوا ہوتا یا طبیعت خراب ہوتی یا وہ ڈپریشن سے دوچار ہوتا تو شہناز آمادگی ظاہر کرتی۔ نتیجہ اب پہلے سے بھی خراب نکلتا تھا۔

ایک دن شہناز نے کہہ ہی دیا۔ ''آپ بہت بدل گئے ہیں۔ آپ کو اب مجھ میں کشش محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کا دل بھر گیا ہے مجھ سے۔''

عثمان بے بسی سے اسے دیکھتا رہا ''یہ مت کہو۔ میری محبت کم نہیں ہوئی، بڑھی ہے۔ کیا وہ گھڑی اب تمہیں یہ بات یاد نہیں دلاتی۔''

''وہ تو بے بس، بے جان ہے۔ طوطے کی طرح رٹا رٹایا سبق دہراتی رہتی ہے۔''

''ایسا مت کہو۔ وہ میرے دل کی آواز ہے، جسے مناسب اور موثر لفظ نہیں ملتے۔''

اب وہ صحیح معنوں میں پریشان تھا اور اس کا کوئی حل اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

انتقام جیسا کوئی طاقتور جذبہ فطرت سے ساز باز کرتا ہے تو عورت کی نسوانی سوجھ بوجھ بہت بڑھ جاتی ہے یہ بات شہناز نے سہاگ رات کو ہی ثابت کر دی تھی۔ وہ ایک کثیر المقاصد اور کثیر النتائج جنگ لڑ رہی تھی۔ پہلے ہی مرحلے میں اس نے عثمان کو احساس محرومی، احساس جرم اور شرمندگی سے دوچار کر دیا تھا۔ ان میں احساس محرومی سب سے خطرناک اور مضر تھا۔ آدمی سب کچھ پا لے لیکن اسے کچھ بھی نہ ملے تو اس کی اذیت کی کوئی حد نہیں ہوتی اور یہ اذیت سب سے زیادہ دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سوچنے سمجھنے اور فیصلے کرنے کی قوت بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ احساس محرومی مسلسل رہے تو پھر یہ قوتیں ختم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ شہناز جانتی تھی کہ عثمان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

ان کے درمیان اس مسئلے پر گفتگو بھی ہوئی تھی اور یہ طے پایا تھا کہ وہ خود بھی ضرورت کا اظہار کر سکتی ہے۔ یوں اسے ایک اور ہتھیار میسر آ گیا تھا جس دن وہ اسے تھکا ہوا اور ڈپریس نظر آتا، وہ جاتی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی۔ کبھی وہ اس کا ہاتھ تھام لیتی اور اسے پگھلا دینے والی نگاہوں سے تکنے لگتی۔

وہ راغب نہ ہونے کے باوجود اس کی خواہش کا احترام کرتا۔ اس خواہش کا احترام جو سچی نہیں' محض اوپری ہوتی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اچھا نہیں نکل سکتا تھا۔

وہ یہ سوچ کر مسکرا دی۔ اسے اپنی ہی دی ہوئی مثال یاد آ گئی۔ اس نے اس میں ترمیم کر ڈالی۔ اب یوں ہوتا ہے کہ دو ایسے کھلاڑی ٹیبل ٹینس کھیل رہے ہوتے تھے جو کھیلنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک نہیں' دونوں کھلاڑی۔ صورتحال پہلے سے خراب ہو گئی تھی۔

پھر یہ سوچ کر اسے غصہ آنے لگتا کہ عثمان کیسا مرد ہے۔ اس کے رد کرنے پر اپنی خواہش سے دست بردار ہو جاتا ہے اور اس کی خواہش کا ہر حال میں احترام کرتا ہے۔ مرد ایسے تو نہیں ہوتے۔ وہ تو اپنی مرضی کرتے ہیں وہ تو منہ زور گھوڑی کو بھی رام کر لیتے ہیں اور وہ بھی محض طاقت کے بل پر۔ مرد ایسے تو نہیں ہوتے۔

خود شہناز پر بھی کبھی کبھی دورے پڑتے۔ کبھی کبھی یوں ہوتا کہ اس کا دل عثمان کے قرب کیلئے مچلنے لگتا۔ اسے اس پر ٹوٹ کر پیار آتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔ ایسے میں وہ خود کو باندھ کر رکھتی۔ یاد کرتی کہ وہ اس کے اور مشکور کے ساتھ کیا کر چکا ہے۔ ایسے میں وہ خود پر اس کی نفرت اور شدت سے طاری کرنے کی کوشش کرتی۔

ایک رات عثمان نے اس سے قریب ہونے کی کوشش کی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ عثمان کا چہرہ طلب کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں خوبصورت سی وحشت کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ خواہش کی آگ میں تپ رہے تھے۔

اس روز عجیب بات ہوئی۔ عثمان نے اسے چھوا تو اس کے وجود میں جیسے جھماکے سے ہونے لگے۔ پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ ایک جانی پہچانی خواہش نے اس کے پورے وجود کو جیسے جکڑ لیا۔ بس دماغ نجانے کیسے اس گرفت سے آزاد رہ گیا تھا اور دماغ بھی وہ جس نے اس ہنگامی صورتحال میں بہت تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا اور اس دماغ نے اسے بچا لیا۔

اسے احساس ہوا کہ اس لمس نے اس کے وجد کو دہکا دیا ہے۔ اس کا جسم کا ٹمپریچر بڑھ رہا تھا۔ سانسیں بوجھل اور بے ترتیب ہونے لگیں۔ وہ جانتی تھی کہ ابھی عثمان کو اس کا ہاتھ سرد لگ رہا ہوگا۔ اس کے جسم کی حرارت ابھی عثمان کے جسم کی حرارت سے کم تھی لیکن بتدریج بڑھ رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ اس طرح چند منٹ اور گزر گئے تو عثمان کو اس کے ہاتھ کی گرمی کا پتا چل جائے گا اور اس کیلئے پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔

اس نے تیزی سے لیکن نرمی سے دوسرے ہاتھ سے عثمان کا ہاتھ تھام کر اسے ہٹا دیا ''سوری...... آج میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔''

عثمان اسے بہت غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی۔ آنکھیں خون کبوتر کی

طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس بار وہ ضبط نہیں کر سکے گا۔ اس پر جھپٹے گا اور اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔

وہ سحر زدہ سی اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ وہ اس کے اندر ہونے والی کشمکش کو خوب سمجھ رہی تھی۔ اس کا اپنا حال بھی عجب تھا۔ اس نے خود کو سختی سے نہ باندھا ہوتا تو وہ اس سے لپٹ گئی ہوتی۔ وہ اس آگ میں جل رہی تھی جو اتفاق سے اور بے خبری میں لگی تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ اس پر جھپٹ پڑے گا اور وہ جانتی تھی کہ ایسا ہوا تو وہ مزاحمت نہیں کرے گی بلکہ خود بھی اس کا ساتھ دینے لگے گی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھے جا رہے تھے۔

شہناز کے جسم کی پکار ہر لمحہ بلند آہنگ ہوتی جا رہی تھی اب تو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر خواہش چیخ رہی ہو۔ اس کے جسم کا رواں رواں عثمان سے التجا کر رہا تھا کہ وہ اسے اپنا لے۔ اسے یقین تھا کہ یہ التجا اس کی آنکھوں میں بھی چلا رہی ہو گی۔ اس کا دماغ جسم کے خلاف' خواہش کے خلاف مزاحمت کر رہا تھا' اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی مزاحمت لمحہ بہ لمحہ کمزور ہو رہی تھی۔ یہ بہت خطرناک بات تھی اگر اس نے اس کی نگاہوں کی التجا سمجھ لی تو......

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بظاہر اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہے لیکن درحقیقت وہ نہیں دیکھ رہا ہے۔ ہاں...... وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا خالی پن تھا' جس سے پتا چلتا تھا کہ اس کی نگاہوں کے سامنے صرف خلا ہی خلا ہے۔

ہوا بھی یہی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے والا اس کی نگاہوں کی التجا نہ دیکھ سکا۔ ایک جھٹکے سے اس نے رخ بدلا اور اس کی طرف پیٹھ کر کے بستر پر دراز ہو گیا لیکن وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کا جسم بری طرح لرز رہا ہے۔

اسی لمحے شہناز کے دماغ کی مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔ ساتھ ہی اس کا اپنا جسم بھی لرزنے لگا۔ اس لمحے اسے عثمان پر ترس بھی آنے لگا شاید اس لیے کہ وہ اپنے حوالے سے بھی سمجھ سکتی تھی کہ وہ کس عذاب سے گزر رہا ہے مگر پھر اس کا وجود اس کی نفرت سے بھر گیا۔ تم مرد نہیں ہو۔ مجھے تم سے نفرت ہے...... نفرت ہے۔ تم مرد نہیں ہو۔ اس کا پورا وجود بے آواز چلا رہا تھا۔ یہی دو جملے دہرائے جا رہا تھا۔

وہ بھی لیٹ گئی لیکن نفرت کے اس طوفان میں بھی اس کے اندر ایک آس کا دیا جل رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ کسی بھی لمحے وہ پلٹے گا اور...... وہ نفرت کا بوجھ اٹھائے آس کے اس جھولے میں پینگیں لیتی رہی۔ خواہش کی آگ ایسے بھڑکی تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

دیر ہو گئی...... بہت دیر ہو گئی۔ جیسے صدیاں گزر گئیں۔ خواہش کا وہ بوجھ اس کیلئے ناقابل برداشت ہو گیا...... وہ دل میں آس لیے متوقع نظروں سے اس کی پیٹھ تکتی رہی۔ عثمان کے جسم کی لرزش معدوم ہو چکی تھی اور کچھ دیر گزری تو اس کا ضبط جواب دے گیا۔

''عثمان...... عث...... مان......'' اس نے جذبات سے چھلکتی آواز میں اسے پکارا۔ اپنی آواز وہ خود بھی نہ پہچان سکی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے کئی بار پکارا پھر اسے ہلایا اب وہ چت لیٹا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ جھنجلا گئی کہ وہ بے خبر سو رہا ہے۔ آگ لگانے والوں کو یوں سونا زیب نہیں دیتا۔

اب وہ رک نہیں سکتی تھی۔ وہ فطرت کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا گئی تھی۔ اس نے عثمان کو جھنجھوڑا۔ خاصی دیر بعد اس نے نندا سی آنکھیں کھولیں ''کیا بات ہے؟'' وہ اب بھی نیند میں تھا۔

شہناز کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کہے۔ کیا شکست کا اعتراف کرلے؟ ''تم سو کیوں رہے ہو؟ مجھ سے باتیں کرو نا'' اس نے بھاری...... اجنبی آواز میں کہا۔

''سو جاؤ۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں'' عثمان نے کہا اور جواب مکمل ہونے سے پہلے پھر سو گیا۔

اس بار شہناز کو بے بسی اور مایوسی نے پوری طرح جکڑ لیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ اپنے عمل کی لپیٹ میں خود آ گئی ہے۔ اب تک وہ خود تکلیف اٹھائے بغیر عثمان کیلئے جس کرب کا سامان کرتی رہی تھی' اندازہ ہو رہا تھا کہ اب اسے بھی وہ کرب برداشت کرنا پڑے گا بلکہ اس پہلے ہی موقع پر تو اس کا کرب عثمان کے کرب سے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔

کرب پر مستزاد اس کی تشویش تھی۔ جسم کے تقاضے ایک بار شروع ہو جائیں تو ان کا کہیں اختتام نہیں ہوتا۔ اسے اس کا توڑ کرنا تھا ورنہ اس کا انتقام اب اس کے ہی خلاف کام کرنے والا تھا اور یہ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس رات وہ ایک منٹ کیلئے بھی نہیں سو سکی۔ فجر کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ نو بجے دستی گھڑی کے آئی لو یو نے اسے جگا دیا۔ ''شٹ اپ یو فول'' وہ غرائی۔ ''چپ ہو جاؤ' بند کرو یہ منحوس آواز'' اس نے گھڑی اتار کر بے دردی سے ایک طرف پھینک دی پھر اس نے بستر پر نظر ڈالی عثمان موجود نہیں تھا۔ وہ شاید باتھ روم میں تھا۔

☆☆☆☆☆

اس خبر نے عثمان حفیظ کی سب کلفتیں دور کر دیں' سب اذیتیں دھو ڈالیں کہ وہ باپ بننے والا ہے۔

سب کچھ جیسے جادو کے زور سے بدل گیا لیکن نہیں...... بدلا کچھ بھی نہیں تھا۔ بس بے اثر ہو کر رہ گیا تھا۔ وہی شہناز کے رویوں کی دھوپ چھاؤں تھی جس میں چھاؤں بہت کم اور دھوپ بہت زیادہ تھی۔ التفات بے حد موہوم اور سرد مہری بے حد واضح تھی۔ وہ اس کے مزاج کے موسموں میں چیخ رہا تھا اور جی رہا تھا لیکن اس کی محبت تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا' اس نے قبول کر لیا تھا۔

وہ عرصہ عثمان کیلئے بے حد الجھا دینے والا تھا۔ کبھی کبھی یونہی اسے محسوس ہوتا کہ شہناز اس سے نفرت کرتی ہے لیکن یہ محض ایک احساس تھا' جسے کسی ثبوت' کسی دلیل کا سہارا میسر نہیں تھا۔ شہناز کا رویہ بہت

اچھا تھا۔ اس نے کبھی اس سے بدتمیزی سے بات نہیں کی تھی نہ ہی کبھی انداز سے ایسا کچھ ظاہر کیا تھا پھر بھی کبھی کچھ لمحے ایسے آئے' جن میں عثمان کو واضح طور پر احساس ہوتا کہ وہ اس سے نفرت کر رہی ہے۔

عثمان کبھی اس پر غور کرتا تو اسے اپنی کوتاہی کا احساس ہونے لگتا۔ کوتاہی کے علاوہ یہ احساس الگ ہوتا کہ شہناز کو پانے کے باوجود بھی وہ بدقسمت ہے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی کی سب سے بڑی خوش بختی شہناز کا حصول تھا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے باوجود بدقسمتی نے اس کا دامن تھام لیا تھا۔

ازدواجی زندگی کا جو سب سے حسین اور نازک پہلو ہوتا ہے' وہ ابھی تک ادھورا تھا۔ وہ ایسا پیاسا تھا جو صاف شفاف اور شیریں پانی کے دریا کنارے بھی پیاسا کھڑا تھا۔ وہ پانی پیتا...... اتنا پیتا کہ مزید پینے کی گنجائش نہ رہتی لیکن پیاس اپنی جگہ رہتی۔ حلق میں پڑے ہوئے کانٹے اپنی جگہ سرکشیدہ رہتے اور کرب صرف یہی نہیں تھا کہ اس کی پیاس نہیں بجھی' اسے تو دریا کی پیاس کا غم بھی کھائے جا رہا تھا۔ پشیمانی کرب پر مستزاد تھی۔

وہ اس صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کرتا تو اس کی سمجھ میں صرف ایک بات آتی۔ اس کے اور شہناز کے ستارے ہی نہیں ملتے تھے۔ اسے شہناز سے محبت تھی...... بے پایاں محبت' اتنی محبت کہ لفظوں سے' عمل سے اس کا اظہار کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ صرف اسے حقیر کیا جا سکتا تھا۔ بلور کا وہ تاج محل' اظہار محبت کرنے والی وہ گھڑی...... یہ اس کے اظہار محبت کی کوششیں تھیں اور اب وہ سوچتا تو وہ خود اسے بھی گھٹیا پن لگتا۔ جو کچھ تھا' وہ اسے ظاہر کرنے سے قاصر تھیں۔ بس وہ ایک گھٹیا' بھڑکیلا سا اظہار تھا وہ خود بھی سوچتا تو وہ اسے محبت جتانے کی گھٹیا کوشش لگتی۔

مگر وہ عرصہ جہالت کی بات تھی۔ عرصہ جہالت کی سوچ تھی۔ شادی سے پہلے وہ ہمیشہ سوچتا رہا تھا کہ شہناز کو کیسے بتائے گا۔ کیسے بتائے گا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے تب اسے یہ دو آئیڈیے سوجھے تھے۔ اس وقت اس کا خیال تھا کہ بات بن جائے گی...... محبوب تک اپنی پوری شدت کے ساتھ نہ سہی' بہر حال پہنچ جائے گی لیکن شادی کی اگلی صبح اسے ان کے حقیر ہونے کا احساس ہونے لگا۔ اس نے بے بسی سے سوچا کہ دنیا میں کسی بھی زبان میں وہ جملہ کہہ دیا جائے...... میں تم سے محبت کرتا ہوں...... آئی لو یو...... جو انسان روز ازل سے اپنے محبوب سے کہتا آ رہا ہے اور اس کے باوجود روز ازل سے تشنہ ہے تو اس لیے کہ یہ محض ایک بیان ہے' جس میں محبت کی شدت سموئی نہیں جا سکتی اور لہجہ بھی کہاں تک ساتھ دے سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ لہجے کی رسائی بہت دور تک' بہت اوپر تک ہے لیکن مقام محبت تک پہنچنے سے بہت پہلے...... بہت پہلے لہجے کے پر جل جاتے ہوں گے۔

سو وہ محبت میں سرشار موثر اظہار محبت کی آرزو میں جلتا رہا۔ پھر شادی کے بعد اس کی سمجھ میں بہت کچھ آ گیا۔ سمجھانے والا کوئی اور نہیں' اس کی اپنی شدت تھی۔ اب وہ اس کی دسترس میں تھی اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس پر حق دیا تھا تو اس کا کیا کیا جی چاہتا تھا۔ وہ سوچتا کہ کسی طرح شہناز کو مائع میں تبدیل کر

دے۔مہکتا' خوش رنگ آتشی سیال بنائے اور گھونٹ گھونٹ پی جائے۔وہ سوچتا کہ وہ اس کیلئے آسمان سے اتاری جانے والی بے بدل غذا ہے۔وہ اسے کھالے......یہ سب کچھ اس کی شدت اس سے کہتی تھی اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ شادی اللہ تعالیٰ کے بیش بہا تحائف میں سے ایک ہے۔شادی اظہار محبت کیلئے وہ پیرایہ عطا کرتی ہے' جو دنیا کی کسی زبان میں ممکن نہیں۔

یوں اسے موثر ترین پیرایہ اظہار میسر آ گیا۔وہ اس کی قربت میں ہوتا تو اس کے جسم کا رواں رواں' اس کی ہر سانس' دل کی ہر دھڑکن......غرض کہ اس کا پورا وجود شہناز سے اظہار محبت کر رہا ہوتا لیکن وہ طمانیت جو اظہار سے مشروط ہوتی ہے' اب بھی اسے میسر نہیں تھی بلکہ شرمندگی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

اب وہ اس پر غور کرتا رہا۔اس کے سامنے ایک جہان معنی کھل گیا۔اس کی سمجھ میں اور بہت کچھ آنے لگا۔کیمیاوی عمل میں ہر جگہ مخصوص حالات میں عناصر کی یکجائی کی شرط ہوتی ہے اور محبت بھی کیمیاوی عمل ہے۔ہائیڈروجن اور آکسیجن مل جائیں تو پانی بنتا ہے لیکن فضا میں ہائیڈروجن اور آکسیجن ساتھ رہتے ہیں اور پانی نہیں بنتا۔پانی تو جب بنے گا جب ہائیڈروجن اور آکسیجن مخصوص کیمیاوی حالات میں یکجا ہوں۔

کمی بس یہیں تھی۔وہ اور شہناز یکجا تھے لیکن مخصوص حالات اور عوامل کی شرط پوری نہیں ہو رہی تھی اس لیے اسپارک نہیں ہوتا تھا۔کمی عمل انگیز کی تھی بلکہ عمل انگیز کی بھی نہیں' عمل انگیز جذبہ تو موجود ہوتا تھا کبھی یہاں اور کبھی وہاں لیکن عمل انگیز کی موجودگی میں دونوں عناصر یکجا نہیں ہو پاتے تھے۔

اس نے اس سلسلے میں کوشش شروع کر دی لیکن بات پھر بھی نہیں بنی۔وہ اپنی طرف سے ہر قربانی دیتا رہا۔شہناز کا اشارہ ملتا تو وہ تیار ہو جاتا لیکن وہ محسوس کرتا کہ اس وقت اس کے اندر کوئی کیمیاوی تحرک نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن وہ بے حد رومینٹک موڈ میں تھا۔اس نے پیش قدمی کی تو شہناز نے اسے روک دیا۔اس روز اس کے اندر جو وحشت ابھری' اس نے اسے خوف زدہ کر دیا۔وہ نہیں رکنا چاہتا تھا۔وہ اس وقت منہ زور پہاڑی دریا کے مانند تھا' جو راستے میں پڑی بھاری بھرکم چٹانوں کو ٹھوکریں مار کر' جھاگ اڑاتا آگے ہی آگے نکل جانا چاہتا تھا۔اس نے سوچا' یہ کون ہوتی ہے مجھے میرے حق سے روکنے والی۔میں نہیں رکوں گا' میں اسے روند ڈالوں گا......توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔

لیکن عین وقت پر محبت نے مداخلت کر ڈالی۔محبت میں روندا نہیں جاتا۔محبوب کو توڑا پھوڑا نہیں جاتا۔وہ ہٹ گیا لیکن ضبط کا بہت دشوار مرحلہ تھا۔اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔دانت ہونٹوں میں گڑے تھے۔وجود میں عمارتوں کو خس و خاشاک کی طرح اڑا لے جانے والی آندھیاں چل رہی تھیں۔

وہ طوفان کی سی خاموشی سے پلٹ گیا۔

اس روز ڈپریشن کی حد ہو گئی تھی۔وہ کبھی حیوانی جذبوں کا آدمی نہیں رہا تھا۔اس کے مزاج میں لطافت بہت تھی مگر اس روز جو کچھ ہوا' اس نے ثابت کر دیا کہ اس میں حیوانیت بھی چھپی ہے۔البتہ یہ ہے کہ وہ اس سے بے خبر رہا۔کیا آدمی یوں خود سے بے خبر بھی رہتا ہے۔یہ بات ڈرا دینے والی نہیں تھی۔

وہ بہت شرمیلا آدمی تھا۔اس کی فطرت میں حجاب تھا۔وہ کسی سے اس موضوع پر کبھی بات نہیں کر سکا تھا۔دوستوں کی شادیوں کے موقعوں پر اکثر باتیں ہوتی رہتی ہیں۔اس نے کبھی ان میں دلچسپی نہیں لی تھی لیکن اب وہ وقت آ گیا تھا کہ باہر سے مدد لینا اس کیلئے ضروری ہو گیا تھا ورنہ وہ عمر بھر یہ ڈپریشن پالتا رہتا۔تباہ ہو کر رہ جاتا۔

دوستوں میں ایک احسان ہی ایسا تھا' جس سے وہ بات کر سکتا تھا۔وہ بچپن کا بے تکلف دوست تھا لیکن اس سے پہلے عثمان کے نزدیک بے تکلفی کا کبھی یہ مفہوم نہیں رہا تھا کہ نجی نوعیت کی انتہائی ذاتی باتیں بھی کی جا سکتی ہیں مگر اب معاملہ ایسا تھا کہ رہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

سو اس نے احسان کو سب کچھ کہہ سنایا۔احسان نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی' پھر بولا ''یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں۔''

''غیر معمولی بات نہیں؟'' عثمان نے عجیب سے لہجے میں دہرایا۔''نہ ہوتی تو میں کبھی تم سے اس سلسلے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔''

''میں جانتا ہوں لیکن تم نے میری پوری بات سنی ہی نہیں'' احسان نے کہا ''یہ واقعی غیر معمولی بات نہیں اتنے تواتر اور تسلسل سے اس کا ہونا اور اس کا کوئی سبب بھی ہو گا۔''

''وہی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔لگتا ہے' پاگل ہو جاؤں گا۔''

احسان کچھ دیر سوچتا رہا ''کوئی نفسیاتی گرہ ہی ہو سکتی ہے'' اس نے پرخیال لہجے میں کہا اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں ''تم بھابی کا بہت احترام کرتے ہو نا؟''

''محبت کا احترام تو تم سمجھ سکتے ہو۔میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔''

''اور تمہارے ذہن میں پاکیزگی کا بے حد واضح تصور ہے۔''

''وہ تو ہے۔''

''بات سمجھ میں آ گئی۔تمہارے اندر مزاحمت موجود ہے۔قربت میں تمہیں یہ خیال رہتا ہے کہ تم اس تعلق کی پاکیزگی کو تباہ کر رہے ہو'' احسان نے کہا۔

اب عثمان سوچتا رہا پھر اس نے کہا ''ممکن ہے یہ بات ہو۔لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس کے بعد اچانک میں اتنا پرجوش کیوں ہو جاتا ہوں'' اس نے نفی میں سر ہلایا ''نہیں' یہ بات نہیں ہو سکتی۔یہ رشتہ' یہ تعلق خود سب سے بڑی پاکیزگی ہے اگر میرے ذہن میں یہ خیال ہوتا تو میں کبھی اس کے قریب جاتا ہی نہیں۔''

''قریب جانے کی خواہش تو فطری ہے'' احسان نے اس کا اعتراض رد کر دیا ''اور تم کہتے ہو کہ

بھابی بھی پیش قدمی کرتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بالکل نارمل ہیں۔ ان کا ارادہ وقتی ہوتا ہے' مستقل نہیں لہٰذا اس معاملے میں وہ قصوروار نہیں۔''

''اتفاق ہے کہ جب میں ایگزاسٹ ہوں' تھکا ہوا اور پژمردہ ہوں یا کسی وجہ سے ڈپریس ہوں تو اسے قربت کی سوجھتی ہے'' عثمان نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے یہ موضوع چھیڑا ہی کیوں؟

''اور وہ بھی یہی بات سوچتی ہوں گی؟''

''کیا مطلب؟''

''یہی کہ تمہیں بھی ایسے ہی وقت میں قربت کی سوجھتی ہے۔''

''بالکل یہی بات ہے'' عثمان نے جوش سے کہا ''وہ یہ بات کئی بار کہہ بھی چکی ہے۔''

''بس تو تمہیں خود کو ٹٹولنا چاہیے۔'' احسان نے ناصحانہ لہجے میں کہا ''آسودگی درحقیقت اندر کی چیز ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی اندر سے ناآسودہ ہو...... اندر کوئی رکاوٹ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بس اندر کی اس رکاوٹ کو تلاش کر کے دور کر لو۔ مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''لیکن میرے اندر کوئی رکاوٹ نہیں'' عثمان نے بے بسی سے کہا ''میں جس شدت کے ساتھ اس کی طلب کرتا ہوں' تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''آدمی کو اپنے لاشعور کی خبر ہو تو اسے لاشعور کہا ہی کیوں جائے'' احسان نے فلسفیانہ لہجے میں کہا ''پھر تو وہ شعور ہو گیا نا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے لاشعور سے آگہی حاصل کرو۔''

عثمان نے اس مشورے پر بڑے خلوص سے عمل کیا۔ اس نے خود کو ٹٹولا...... بلکہ کھنگال ڈالا لیکن کوئی رکاوٹ نہیں ملی۔ اس نے جھنجلا کر سوچا کہ یہ رکاوٹ دوسرے فریق کے ہاں بھی تو ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے شہناز کے لاشعور میں کوئی نفسیاتی گرہ ہو۔ اس نے سوچا ضرور لیکن شہناز سے یہ ثقیل گفتگو کرنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔

پھر وہ پورا معاملہ پس منظر میں چلا گیا۔ اہمیت صرف اس بات کی رہ گئی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ وہ بہت بڑی خبر تھی اس کیلئے۔ شہناز کیلئے اس کی محبت سوگنا بڑھ گئی۔ تشنگی کا احساس بھی ختم ہو گیا۔ اظہار کی حاجت بھی ختم ہو گئی اور کیا چاہیے؟ اظہار تو اس نے کر دیا تھا...... اور اسے جواب بھی مل گیا تھا۔

اسے صرف ایک ہی فکر رہ گئی۔ شہناز کی اور اپنے بچے کی بہتری کی فکر۔ وہ ڈاکٹر سے ملا اور اس کی ہدایات ذہن نشین کر لیں پھر وہ ان پر عمل کرنے میں لگ گیا۔ شہناز کوئی کام کرتی تو وہ اسے روکتا۔ وہ تیز قدموں سے چلتی تو وہ چیخ اٹھتا۔ وہ اس کی غذا کا خیال رکھتا۔ اس کیلئے پریشان ہوتا جیسے وہ شوہر نہیں' اس کی ماں ہو۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ رسم کے مطابق پہلی زچگی کیلئے لڑکیاں میکے جاتی ہیں۔ فہمیدہ بیگم شہناز کو لینے

کیلئے آئیں تو وہ متوحش ہو گیا۔ ''آنٹی...... آپ یقین کریں' میں شہناز کا اتنا خیال رکھتا ہوں۔ آپ پوچھ لیں......''

فہمیدہ بیگم ہنسنے لگیں ''وہ تو میں جانتی ہوں بیٹے لیکن یہ رسم ہے ہمارے ہاں کی۔ یہ تمہاری امانت تمہاری اجازت سے لے کر جا رہی ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے آنٹی لیکن......''

''لیکن ویکن کی اس میں گنجائش نہیں'' فہمیدہ بیگم نے اس کی بات کاٹ دی ''اچھا ہے' یوں تمہیں سزا بھی مل جائے گی۔''

''سزا؟ کس بات کی سزا؟'' اس نے آنٹی کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا۔

''شادی کے بعد تم ہمارے گھر کا رستہ ہی بھول گئے۔ یہ یاد ہی نہیں رہا تمہیں کہ تمہارا ایک گھر اور بھی ہے۔''

عثمان شرمندہ ہو گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ واقعی اس سے یہ کوتاہی سرزد ہوئی ہے۔ اسے حیرت ہونے لگی۔ اتنے عرصے میں شہناز نے کبھی ایک بار بھی اس سے نہیں کہا تھا کہ وہ اسے گھر لے کر چلے۔ اتنے عرصے میں وہ صرف چار پانچ بار گھر گئے تھے۔

اس کے ساتھ ہی اسے ایک خوش آئند خیال آیا۔ ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ہر لڑکی میکے جانے کی ضد کرتی ہے۔ وہی لڑکیاں میکے جانے کا نام نہیں لیتیں' جن کا سسرال میں دل لگ جائے بلکہ جو اپنے شوہر سے اس درجہ محبت کرتی ہوں کہ ان کا ایک پل کیلئے بھی نظروں سے اوجھل ہونا نہیں گوارا نہ ہو۔

یہ دلیل محبت اتنی خوش کن تھی کہ اسے جدائی کا ملال بھی نہیں ہوا۔ فہمیدہ آنٹی کو اسے ساتھ لے جانے سے تو وہ ویسے بھی نہیں روک سکتا تھا۔

''آنٹی...... یقین کریں میں شرمندہ ہوں۔ اب تلافی کر دوں گا'' اس نے جواب دیا۔

☆☆☆☆☆

یہ انکشاف کہ وہ ماں بننے والی ہے' شہناز کیلئے بہت بڑا شاک تھا۔ وہ اور عثمان کے بچے کو اپنی کوکھ میں پالے۔ عثمان' جس سے اسے شدید نفرت تھی جس کی زندگی کو اس نے بڑی کامیابی سے نشان اذیت بنا دیا تھا۔ وہ اس سے یوں ہار جائے گی۔

بدقسمتی یہ ہوئی کہ اسے اس بات کا اندازہ کافی دیر سے ہوا لیڈی ڈاکٹر سے اس نے بات کی تو وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ ''مسز عثمان' یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں اتنی جلدی ماں نہیں بننا چاہتی۔''

''لیکن یہ آپ کا پہلا بچہ ہے'' ڈاکٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ابھی میں زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی سے یہ ذمے داری اٹھانا مجھے پسند نہیں۔''

''آپ جیسے بڑے لوگ تو دس بچوں کے باوجود بھی انجوائے کر سکتے ہیں۔ آپ تو اپنی ذمے داری معقول تنخواہ پر کسی کو بھی سونپ سکتی ہیں۔''

''سوری مسز عثمان۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ بات بہت آگے جا چکی ہے۔''

''ہو کیسے نہیں سکتا.....؟''

''آپ ڈاکٹر ہوتیں تو سمجھ سکتی تھیں' یہ آپ کا پہلا موقع ہے۔ آپ کی صحت اور جسمانی کیفیت میرے سامنے ہے۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ یہ کام تو ہو جائے گا لیکن آپ کی زندگی کی ضمانت میں نہیں دے سکتی۔ پچاس فیصد سے زیادہ امکان یہ ہے کہ آپ نہیں بچ سکیں گی۔''

شہناز کا چہرہ فق ہو گیا۔ زندگی سے اسے بے انداز محبت تھی۔ یہ رسک وہ لے ہی نہیں سکتی تھی مگر یہ تصور ہی اس کیلئے روح فرسا تھا کہ وہ عثمان کے بچے کو جنم دے گی۔ بہرکیف اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تن بہ تقدیر ہو گئی لیکن عثمان سے اس کی نفرت بہت بڑھ گئی۔

ایک اچھی تبدیلی بھی ہوئی۔ عثمان کے جسمانی تقاضوں سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ وہ جس بچے کے تصور سے ناخوش تھی' عثمان اس کے تصور میں سرشار تھا۔ لگتا تھا' اسے اب اس کی کوئی پروا نہیں رہی ہے۔ چند روز تو وہ خوش رہی پھر اسے احساس ہوا کہ اس تبدیلی کے نتیجے میں اذیت کا وہ کھیل ہی موقوف ہو گیا ہے' جس کی خاطر اس نے عثمان سے شادی گوارا کی تھی چنانچہ اس نے خود تقاضے شروع کر دیئے۔

مگر کچھ ہی دن بعد وہ اس کھیل سے دستبردار ہو گئی۔ اس کے مطلوبہ نتائج نکل ہی نہیں رہے تھے۔ بچے کی خوشی میں عثمان راضی بہ رضا ہو گیا تھا۔ وہ یوں سراپا تسلیم ہوا تھا کہ اسے کچھ بھی برا نہیں لگتا تھا۔

شہناز کا ڈپریشن بڑھتا گیا۔ تمام وقت اس کے اندر ایک ہی جملہ تڑپتا مچلتا رہتا تھا..... آئی ہیٹ یو۔ اس کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر اس کا ہدف بھی ایک نہیں رہا تھا' دو ہو گئے تھے۔ وہ پیٹ میں پلنے والے بچے سے بھی یہی کہتی رہتی تھی..... آئی ہیٹ یو..... مجھے نفرت ہے تم سے۔

لیکن پھر وہ بچے کی احسان مند ہو گئی۔ اس کی وجہ سے تو امی اسے لینے کیلئے آئی تھیں۔ اسے قید سے رہائی مل رہی تھی اب جبکہ اس کے مقاصد پورے نہیں ہو رہے تھے تو عثمان کے ساتھ رہنا اسے قید سخت معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کا..... نہیں' عثمان کا بچہ اسے رہائی دلا رہا تھا۔

وہ امی کے ہاں چلی گئی۔ عثمان ہر شام اس سے ملنے آتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کیلئے کچھ نہ کچھ لاتا۔ وہ بے دلی سے قبول کر لیتی۔ عثمان ہمیشہ رات کا کھانا کھا کر واپس جاتا تھا۔ ممی اور پاپا کے اصرار کے باوجود اس نے رات کو رکنا بھی گوارا نہیں کیا' یہ بھی اچھا ہی تھا ورنہ وہ اس کے کمرے میں ہی سوتا۔ ممی نے اس کیلئے وہی کمرا ٹھیک کروا دیا تھا' جس میں وہ پہلے رہا کرتی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اب اس میں ڈبل بیڈ ڈلوا دیا گیا تھا۔

وہ خوش تھی کہ چلو منافقت سے کچھ عرصے کیلئے نجات مل گئی لیکن عجیب بات تھی۔ سوتے وقت وہ بیڈ کے عقب کی طرف بائیں جانب نگاہ ضرور کرتی اور کئی بار کرتی۔ اس کا دل عجیب طرح دھڑکتا۔ وہ اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرتی لیکن بات کئی دن بعد اس کی سمجھ میں آئی۔ شاید اس لیے کہ وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی اور غیر ارادی طور پر اٹھنے والی نظروں پر اس کا اختیار نہیں تھا۔

اسے امی کے ہاں رہتے بیس دن سے زیادہ ہو چکے تھے کہ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ رات کو سوتے وقت صبح اٹھتے وقت وہ کیا دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کی نظریں کس چیز کی جستجو کرتی ہیں۔ وہ اس تاج محل کو مس کر رہی تھی' جو اس کی خواب گاہ کی زینت تھا۔ اس احساس نے اس کے ذہن میں کئی سوال اٹھائے..... نازک سوال۔ وہ اس چیز کو کیوں مس کر رہی ہے' جسے عثمان نے اپنی محبت کی علامت قرار دیا تھا؟ اس کے ذہن نے فوراً جواب دیا..... اس لیے کہ اس کے نزدیک وہ عثمان کی حماقت کی علامت ہے۔ وہ اسے یاد دلاتا ہے کہ عثمان کتنا احمق ہے۔ وہ اسے یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ وہ کس ارادے سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی ہے۔ شاید وہ اسے اس لیے بھی مس کرتی ہے کہ اب کیونکہ وہ عثمان کے ساتھ نہیں رہ رہی ہے تو وہ کہیں یہ بات بھول نہ جائے۔

کیا وہ گھر کو بھی مس کر رہی ہے..... اپنے گھر کو یہ سوال بھی چونکا دینے والا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ذہن کوئی جواب دیتا' اس کے اندر بے ساختہ جواب ابھرا..... اور اثبات میں ابھرا۔ ذہن نے فوراً صورتحال کی نزاکت کو بھانپ کر اس کی توجیہہ کی۔ یہی کہ وہ یاد رکھنا چاہتی ہے کہ اسے عثمان سے کس قدر نفرت ہے۔

لیکن ذہن کی مداخلت سے پہلے ہی ایک شک سر اٹھا چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی' کہیں اسے عثمان سے محبت تو نہیں ہوتی جا رہی ہے۔ اس سوال پر اس کا اپنا ردعمل بے حد شدید تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جو کچھ اس نے اس کے اور مشکور کے ساتھ کیا ہے' اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہیں۔ اس سے تو اس کا نفرت کا رشتہ ہے۔

پھر بھی وہ اس معاملے میں جذباتی تردید نہیں چاہتی تھی۔ اس نے معقولیت کے ساتھ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی کوشش کی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عثمان بہت اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ اس کی محبت کے معاملے میں بے اصولی سے قطع نظر اپنے ہر عمل سے وہ اچھا انسان ثابت ہوتا تھا۔ وہ نرم خو' نرم مزاج' نرم گفتار اور محبت کرنے والا تھا۔ بس اس میں مردانگی کی کمی تھی۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ اگر اس کے دل میں عثمان کی نفرت نے پہلے ہی پنجے نہ گاڑ دیئے ہوتے تو وہ اس کا دل جیت لیتا۔ وہ اس سے محبت پر مجبور ہو جاتی لیکن اب یہ ممکن نہیں' قیامت تک نہیں۔

کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ تم سچ بول رہی ہو؟ اس کے اندر سے کسی نے پوچھا۔

ہاں..... سو فیصد یقین ہے۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ اس نفرت کی ہی خاطر میں اسے مس کرتی

ہوں۔ میں اس گھر کو مس کرتی ہو کیونکہ وہیں میں اس سے اس کی کمینگی کا انتقام لے سکتی ہوں۔ میں اس تاج محل کو یاد کرتی ہوں کیونکہ وہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ وہ کس طرح میرے بس میں ہے...... میری مٹھی میں ہے۔

تقریباً ایک ماہ بعد وہ سو کر اٹھی تو متوحش تھی۔ اس نے کلائی ٹٹولی۔ وہ گھڑی کہاں گئی...... عثمان کی آواز میں آئی لو یو کہنے والی۔ اسے یاد آیا کہ وہ تو بہت دن پہلے اس نے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دی تھی۔ مجھے وہ گھڑی چاہیے۔ میں یاد رکھنا چاہتی ہوں کہ میرا اسیر رہا نہیں ہوا ہے۔ سزا پوری ہوئے بغیر وہ رہا نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس کی اسیری کا مکمل یقین چاہیے۔

اس رات گھر جانے سے پہلے عثمان نے معمول کے مطابق اس سے پوچھا ''کچھ منگوانا تو نہیں ہے؟''

''میری ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رسٹ واچ رکھی ہے۔ وہ لیتے آئیے گا'' اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اس سوال کے جواب میں کوئی فرمائش کی تھی۔

''کون سی رسٹ واچ؟''

''وہی منہ دکھائی والی۔''

عثمان بے حد خوش نظر آنے لگے۔ سوچ رہا ہوگا کہ وہ اس کی محبت کو مس کر رہی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔

☆☆☆☆☆

وہ بہت خوبصورت لمحہ تھا' جب عثمان نے اپنے نومولود کو گود میں لے کر اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور اسے اس میں اپنی جھلک نظر آئی۔ وہ سانس لیتے اس ننھے منے معجزے کو سحر زدہ سا دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ابو زندہ ہوتے تو کیسے خوش ہوتے۔ یہ ان کی کتنی بڑی آرزو تھی۔ اس نے پوری نہیں ہونے دی۔

''کیا نام رکھو گے اس کا؟'' نجم الحسن نے اس سے پوچھا۔

''نعمان'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''پیار سے اسے نومی کہیں گے ہم۔''

''بہت خوبصورت نام ہے' اللہ مبارک کرے۔''

وہ سب خوش تھے۔ نجم انکل' فہمیدہ آنٹی' محمود' سعود اور وہ خود۔ خوشیاں دونوں گھروں پر ٹوٹ کر برسی تھیں لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ شہناز خوش نہیں ہے۔ اس نے شہناز سے یہ بات پوچھ ہی لی ''میں اتنی جلدی یہ سب کچھ نہیں چاہتی تھی' وہ بولی ''ابھی تو ہمارے محبت کرنے کے دن تھے۔''

عثمان سرشار ہو گیا۔ کتنی محبت کرتی ہے وہ اس سے ''یہ تو محبت بڑھائے گا'' اس نے فخر سے نعمان کو دیکھتے ہوئے کہا ''یہ کوئی محبت کم تو نہیں کرے گا۔''

''اور پھر مجھے بیٹی کی خواہش تھی' شہناز نے رکھائی سے کہا۔

''یہ تو اللہ کی نعمت ہے جو اس نے دیا' بہت اچھا دیا۔''

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس شدید ہوتا گیا کہ شہناز کو بیٹے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کچھ یہ بھی تھا کہ بچوں کے معاملے میں وہ پھوہڑ تھی۔ اس نے کبھی کسی بچے کو گود میں نہیں لیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ بچے کتنے نازک ہوتے ہیں۔ اس کی گرفت سخت ہوتی۔ بچہ رونے لگتا۔ وہ اس کا کوئی کام نرمی سے نہیں کر سکتی تھی۔

ایک بات عثمان کو بہت ناپسند ہوئی۔ شہناز نے کبھی نعمان کو دودھ نہیں پلایا۔ اس نے ٹوکا تو وہ بولی ''میں کمزور بہت ہوں۔ ڈاکٹر نے منع کیا تھا اسی لیے ابتدا ہی میں فیڈر سے دودھ دیا گیا۔ بعد میں مشکل ہوتی۔''

عثمان نے کچھ کہا تو نہیں لیکن اسے افسوس بے حد ہوا۔ ایسا بچہ جو مقدر میں دنیا کی ہر نعمت لے کر آیا تھا' ایک قدرتی نعمت سے محروم کر دیا گیا۔ کتنی بڑی محرومی ہے یہ؟

پھر ایک دن شہناز نے اس سے کہا ''نعمان کیلئے آیا کا بندوبست کر لیں۔''

''وہ کیوں؟'' عثمان نے بھویں اچکائیں۔

''کیوں کی کیا بات ہے؟ شہناز نے تنک کر کہا ''سب گھروں میں یہی ہوتا ہے۔ میں اس کی اس طرح نگہداشت نہیں کر سکتی' جیسے ہونی چاہیے۔''

''تمہاری یہ بات غلط ہے۔ میں جانتا ہوں کہ زیادہ تر گھروں میں یہ نہیں ہوتا۔''

''میں ان لوگوں کی بات نہیں کر رہی' جو آیا افورڈ نہیں کر سکتے۔''

''میں افورڈ کر سکتا ہوں لیکن اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ ماں باپ کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ وہ بچے خود اعتمادی سے کبھی محروم نہیں ہوتے' جنہیں ماں باپ کا بھرپور لمس اور ان کی محبت ملی ہو۔ جن کے چھوٹے چھوٹے کام ماں باپ کرتے رہے ہوں۔''

شہناز خاموش ہو گئی۔ اس نے اصرار نہیں کیا لیکن چند روز میں ہی عثمان کو احساس ہو گیا کہ یہ کام اسے کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے ایک بے حد خوبصورت آیا رکھ لی۔

بچہ بڑا ہونے لگا۔ شہناز اس سے بالکل ہی بے تعلق ہو گئی تھی۔ عثمان نے اسے اپنی ذمے داری بنا لیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے تمام کام اس نے آیا سے سیکھ لیے اب وہ اس کی نیپی بھی بدل سکتا تھا' اس کیلئے دودھ بھی بنا سکتا تھا۔ وہ دفتر سے جلدی گھر آنے لگا۔ شام کو وہ گھنٹوں اس سے کھیلتا' اس کے ساتھ وقت گزارتا۔ اسے باہر ٹہلانے کیلئے نکل جاتا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بچہ بہت ذہین ہے۔ وہ وقت تک پہچانتا تھا۔ کسی روز اسے دیر ہوتی تو وہ دیکھتا کہ نومی دروازے پر نگاہیں لگائے بیٹھا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ خوشی سے قلقاریاں مارتا۔

”آپا آپ نے کس لیے رکھی ہے آخر؟“ ایک روز شہناز نے غصے سے کہا ”یہ رات کو اسے کیوں نہیں سلاتی اپنے پاس؟“

”اس نے کب انکار کیا ہے لیکن میں یہ نہیں چاہتا“ عثمان نے جواب دیا ”یہ ہمارے ساتھ ہی سوئے گا، تمہیں اس میں اعتراض کیا ہے؟“

”یہ بے بی کاٹ کس لیے ہے؟ اور آپا کس لیے ہے؟“

”اور یہ ماں باپ کس لیے ہیں۔ تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں اس میں اعتراض کیا ہے؟“ عثمان نے نرم لہجے میں کہا۔

”رات کو کئی بار اٹھتا ہے۔“

”تو تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں تو کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے سارے کام تو میں کرتا ہوں۔“

”روتا بھی بہت ہے۔ میری نیند خراب ہوتی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں اسے لے کر دوسرے کمرے میں سو جایا کروں گا“ عثمان نے بڑے تحمل سے کہا۔

”میں اس لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ الگ رہنے والے بچوں کا ڈر نکل جاتا ہے“ شہناز نے پینترا بدلا۔

”میرا نظریہ مختلف ہے۔ جن بچوں کے پاس ماں باپ کے جسموں کی گرمی ہو، اول تو وہ ڈرتے نہیں اور ڈریں تو ماں باپ سے لپٹ کر خوف سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔“

”جو جی چاہے کریں لیکن میری نیند خراب نہ کریں۔“

پھر ان کی شادی کی پہلی سالگرہ آ گئی۔ وہ دفتر گیا تو شہناز سو رہی تھی۔ وہ اس کیلئے بہت خوبصورت تحفہ لے کر گھر آیا تو اس کا دل خوش ہو گیا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ شہناز کو اپنا سہاگ رات کا وعدہ یاد ہو گا۔ وہ وعدہ تو وہ خود بھی بھول چکا تھا۔

شہناز دلہن بنی ہوئی تھی۔ اس نے سہاگ کا وہی جوڑا اور وہی زیورات پہنچ رکھے تھے، جو سہاگ رات میں اس کی آمد سے پہلے اس نے اتار پھینکے تھے۔

عثمان کی شکر گزاری کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس رات تین ماہ کا نعمان اپنی آپا کے پاس سویا۔

☆☆☆☆☆

شہناز کو اپنی کوکھ میں پلنے والے اس وجود سے ویسے ہی نفرت تھی کہ وہ زبردستی اس پر تھوپ دیا گیا تھا، ستم بالائے ستم کہ وہ لڑکا تھا اور ہو بہو عثمان کی تصویر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اسے کب تک اور کیسے برداشت کرے گی۔

وہ نعمان کو دیکھتی تو اس کا خون کھول اٹھتا۔ اسے احساس ہوتا کہ اس کے جسم سے زبردستی خون،

ہڈیاں اور گوشت چھین کر اس بچے کو تخلیق کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ مکمل نہیں رہی ہے۔ وہ کم ہو گئی ہے...... گھٹ گئی ہے ”یاد رکھنا عثمان حفیظ“ وہ بڑبڑائی ”تم آئندہ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکو گے...... یہ میرا تم سے بھی وعدہ ہے اور خود سے بھی۔“

ننھا نعمان باپ کی شفقت اور محبت اور آپا کی نگہداشت کے سائے میں دن گزارتا اور بڑھتا رہا پھر اس نے مما کہنا سیکھ لیا لیکن مما نے اسے گود میں لینا نہیں سیکھا...... چھوٹا سا بچہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ نفرت کیا ہوتی ہے مگر مما کی بے نیازی اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔

شہناز کیلئے وہ بچہ گویا ہو کر بھی نہیں تھا۔ اسے اس کی پروا ہی نہیں ہوتی تھی لیکن خون کے رشتوں کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے۔ کبھی اسے نعمان پر بے ساختہ پیار آتا۔ وہ اسے گود میں اٹھا لیتی اور اس کے چہرے کو بوسوں سے بھگو دیتی۔ اس وقت جیسے اس کے چہرے کے نقوش اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتے تھے۔ ایسے میں وہ حیران ہوتی کہ ممتا جیسے طاقتور ترین جذبے کو اس نے کیسے قابو میں کر لیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ کہا جا سکتا ہے، نفرت محبت کے مقابلے میں زیادہ طاقتور جذبہ ہے کہ ممتا جیسے عظیم جذبے پر حاوی ہو جائے؟ یہ خیال اکثر اسے الجھن میں مبتلا کر دیتا اور اس کے ساتھ ہی نعمان کے چہرے کے نقوش اس کے سامنے اجاگر ہونے لگے۔ اس کے چہرے میں اسے عثمان کا عکس دکھائی دیتا اور وہ اسے پٹخ دیتی۔ ننھا بچہ معصومیت میں لپٹی حیرت سے اسے تکتا رہتا۔

اس نے کتابوں میں پڑھا تھا اور نچلے اور متوسط طبقے کے گھروں میں دیکھا بھی تھا کہ لڑکیاں ان شوہروں کے ساتھ پوری عمر گزار دیتی ہیں، جن سے انہیں شدید نفرت ہوتی ہے...... جو بجا طور پر نفرت کے لائق بھی ہوتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ رہتی ہیں اور بچے پیدا کرتی رہتی ہیں۔ وہ ان سے نفرت کرتی ہیں لیکن ان کے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی ہیں اس لیے کہ وہ ان کے بھی ہوتے ہیں۔ بچوں کیلئے ان کے پاس باپ کا ناپسندیدہ حوالہ تو ہوتا ہے جو کبھی کبھار نفرت بھرے انداز میں استعمال ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر ممتا نفرت پر حاوی آ جاتی ہے۔ عورت کہتی ہے کہ وہ انسان کے بچے نہیں، سنپولیے پال رہی ہے پھر بھی وہ انہیں پالتی رہتی ہے۔ یہ طاقت ہوتی ہے ممتا میں۔

”ہاں...... یہ بات طے ہے۔“ اس کے اندر سے ایک آواز ابھری ”کچلی ہوئی محبت نفرت سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ وہ ممتا پر بھی غالب آ سکتی ہے۔“

”محبت! کچلی ہوئی محبت! شہناز استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ محبت ہوئی ہوتی تو اسے کچلنا بھی پڑتا۔ یہاں تو محبت کبھی تھی ہی نہیں اور نفرت ازلی ہے۔

اس کے اندر کوئی اس سے زیادہ زور سے، اس سے زیادہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔ اس نے اس آواز کو نظر انداز کر دیا۔ دیوانوں سے بھلا کوئی لڑ سکتا ہے؟

☆☆☆☆☆

ثوبیہ کی پیدائش نعمان کے سوا دو سال بعد ہوئی۔ عثمان کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ کمال یہ ہوا کہ اس بار شہناز بھی خوش تھی۔ نعمان کو تو اس نے ابھی تک قبول نہیں کیا تھا اور عثمان جانتا تھا کہ اب کبھی ایسا نہیں ہو سکے گا مگر ثوبیہ خوش نصیب تھی کہ اسے ماں کا دودھ بھی میسر آیا اور ماں بھی ملی۔

اس عرصے میں ننھا نعمان باپ کو ماں کا درجہ بھی دے چکا تھا۔ وہ بہت محبت کرنے والا بچہ تھا۔ اس سلوک کے باوجود بھی وہ ماں سے محبت کرتا تھا۔ کبھی وہ چند لمحوں کیلئے اس پر مہربان ہو جاتی تو وہ ماں پر واری صدقے ہونے لگتا۔ اپنے سارے کھلونے لا کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیتا لیکن اس کیلئے باپ کی تو حیثیت ہی کچھ اور تھی۔ وہ اس کا سب کچھ تھا۔ اس کی پوری کائنات ہی باپ کا وجود تھا۔ عثمان گھر میں موجود ہوتا تو وہ اپنا کوئی کام آیا کو نہ کرنے دیتا۔

''پوٹی پاپا سے دھلواؤں گا۔''

''پاپا...... مجھے دودھ لا کر دیں۔''

''کھانا پاپا کے ہاتھ سے کھاؤں گا۔''

''پاپا کے ساتھ کھیلوں گا۔''

اور عثمان کبھی اس کے کسی کام سے انکار بھی نہیں کرتا تھا۔ جب فرصت ہوتی' وہ خود اسے نہلاتا۔ نعمان کیلئے وہ لمحے بے حد مسرت خیز ہوتے' جب وہ اور پاپا باتھ روم میں شاور کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ نہاتے۔ عثمان اس کے جسم کی مالش کرتا۔ سر میں تیل لگاتا' پھر دونوں لان پر دوڑیں لگاتے۔

کبھی کبھی شہناز عثمان سے کہتی ''آپ لاڈ پیار میں اسے بگاڑ رہے ہیں۔''

''لاڈ پیار!'' عثمان حیرت سے کہتا ''میں تو بس خانہ پری کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ خانہ جو تم نے خالی چھوڑ دیا ہے۔''

''چھوٹی باتوں کو بڑا بنانے میں تو آپ کو کمال حاصل ہے۔''

اور عثمان اسے عجیب نظروں سے دیکھتا رہ جاتا۔ شہناز کی محبت اس کے دل میں پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس نے پہلے ایک بیٹے اور بیٹی کا تحفہ دے کر اسے نہال کر دیا تھا۔ ان کے ازدواجی تعلق کا اب بھی وہی حال تھا لیکن اب عثمان کو کوئی پروا نہیں تھی۔ بچے اس کیلئے وسیلہ اظہار بن گئے تھے۔ ازدواجی زندگی کی خلوتیں معطل ہو گئی تھیں۔ کبھی کبھی اسے بڑی شدت سے کمی محسوس ہوتی لیکن وہ صبر کر لیتا۔

ہمارے ستارے شاید بچوں ہی کی حد تک ملتے تھے' وہ سوچتا......

اس بار اس نے تجویز پیش کی کہ ثوبیہ کو آیا کے پاس سلایا جائے۔ شہناز بھڑک گئی۔ دلیلیں الٹ گئی تھیں۔ جو دلیلیں شہناز نے نعمان کے معاملے میں دی تھیں' وہ اب عثمان دے رہا تھا اور شہناز وہی جوابی دلیلیں دے رہی تھی' جو کبھی عثمان نے دی تھیں۔

''بس تو ہم سب ساتھ سویا کریں گے'' عثمان نے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بیڈ بہت چھوٹا ہے'' شہناز نے اعتراض کیا۔

''بیڈ کی فکر مت کرو۔ میں بہت بڑا بیڈ بنوا لوں گا۔''

شہناز کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ اذیت کا کھیل پھر سے شروع کرنا چاہتا تھا۔ قربت ہو گی تو شعلہ بھڑکے گا۔ شعلہ بھڑکے گا تو آگ لگے گی اور آگ کو بھڑک کر جل بجھنے کا موقع نہیں ملے گا تو جسم سلگتا رہے گا' نہ جلے گا نہ بجھے گا۔

عثمان نے بہت بڑا بیڈ بنوا لیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کیسے سویا جائے۔ عثمان چاہتا تھا کہ وہ دونوں کناروں پر سوئیں اور بچے درمیان میں۔ شہناز کو اعتراض تھا کہ نعمان سوتے میں لاتیں بہت چلاتا ہے۔ ثوبیہ کیلئے خطرناک ہو گا۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ ثوبیہ ماں اور باپ کے درمیان سوئے گی اور نعمان باپ کے برابر کنارے پر۔

کھیل پھر سے شروع ہو گیا۔ وہی خواہش' گریز اور اذیت کا کھیل لیکن اس بار اذیت پہلے جیسی پر اثر نہیں تھی۔

ننھا نعمان بہن سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس کے قریب رہنا' اس سے کھیلنا چاہتا تھا۔ عثمان گھر میں ہوتا تو دیکھتا کہ شہناز نعمان کو کبھی ثوبیہ کے قریب نہیں ہونے دیتی۔ وہ جب بھی ثوبیہ کے قریب جاتا' شہناز اسے جھڑک کر ہٹا دیتی۔

''یہ کیا کرتی ہو تم؟'' ایک دن عثمان نے چڑ کر کہا ''بھائی بہن کے درمیان نہیں آیا کرو۔''

''آپ نہیں سمجھتے' بچے تو معصوم ہوتے ہیں نا۔ خیال تو بڑوں کو رکھنا پڑتا ہے۔'' شہناز نے بے حد رسان سے کہا ''کئی بار ایسا ہوا ہے کہ کھیل ہی کھیل میں نعمان ثوبیہ کے سینے پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ تو میں وقت پر پہنچ گئی ورنہ خدانخواستہ......''

''واقعی؟ یہ خیال تو رکھنا پڑے گا۔''

ثوبیہ بھی بڑی ہوتی جا رہی تھی' وہ گھٹنوں چلنے لگی۔ ٹوٹی پھوٹی باتیں کرنے لگی پھر ڈگمگاتے قدموں سے چلنے بھی لگی لیکن شہناز کی احتیاط پسندی کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی ہی گئی۔ نعمان ثوبیہ کو بہت چاہتا تھا۔ باپ کو بیٹی ویسے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ وہ ثوبیہ اور نعمان کیلئے اپنی محبت کا موازنہ کرتا تو اسے ثوبیہ کا پلہ جھکتا نظر آتا مگر محبت کا عملی اظہار وہ نعمان کے معاملے میں زیادہ کرتا تھا اس لیے کہ نعمان کی ضرورت بڑی تھی۔ وہ ایک طرف سے محروم جو تھا۔ ثوبیہ خوش نصیب تھی۔ اسے کوئی خانہ خالی نہیں ملا تھا۔

دونوں بچے قدرتی طور پر ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے لیکن شہناز اب بھی دونوں کے درمیان دیوار بنی رہتی تھی۔ عثمان نے اس کا حل بھی نکال لیا۔ وہ شام کو جلدی گھر آتا اور دونوں بچوں کو ساتھ لے کر لان میں چلا جاتا۔ وہ دن بھر کے ترسے ہوئے آپس میں کھیلتے رہتے۔ وہ بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ یہ دیکھ کر کہ نعمان ثوبیہ کا کتنا خیال رکھتا ہے اور اس کی خاطر ہر ایثار کیلئے تیار رہتا ہے' اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

سورج غروب ہوتا تو وہ انہیں گھر میں لے آتا وہ اس کے سامنے کھیلتے رہتے۔ یہاں تک کہ سو جاتے۔

ایک دن نعمان نے اس سے کہا ''پاپا...... آپ ہر روز دفتر کیوں جاتے ہیں؟''

عثمان حیران رہ گیا۔ اتنے سادہ اور آسان سوال کا کسی چھوٹے سے بچے کو کیا جواب دیا جاسکتا ہے

''بیٹے...... آپ کیلئے پیسے جو کمانے ہوتے ہیں'' اس نے کہا۔

''لیکن پاپا' مجھے تو پیسے نہیں چاہئیں......''

عثمان تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ ''بیٹے ایک بات بتاؤ۔ یہ اپنا گھر تمہیں اچھا لگتا ہے...... اور یہ گھر کی ساری چیزیں اور تمہارے کھلونے؟''

''جی پاپا!''

''تو بیٹے' میں ہر روز دفتر نہ جاؤں تو یہ سب کچھ چھن جائے گا اس لیے میں روز دفتر جاتا ہوں۔''

ساڑھے چار سال کا بچہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے بڑوں کے سے انداز میں کہا ''یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا پاپا!''

عثمان کو اس پر پیار آ گیا ''مجھے بتاؤ تو کہ مسئلہ کیا ہے۔ مسئلہ ہے تو اس کا حل بھی ہوگا۔''

''بات یہ ہے پاپا کہ آپ آفس نہ جائیں تو میں اور ٹوبیہ دن بھر ساتھ کھیل سکتے ہیں۔''

عثمان سوچنے لگا۔ اس نے پچھلے سال نومی کو اسکول میں داخلہ دلایا تھا اور اب چھٹیاں تھیں ''لو مسئلہ حل ہو گیا'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا ''ہم دفتر سے پندرہ دن کی چھٹیاں لیں گے اور تمہیں پورا پاکستان دکھائیں گے۔ خوب کھیلنا تم......''

نومی اس سے لپٹ گیا ''پاپا...... آپ بہت اچھے ہیں' آئی لو یو۔''

اس نے اس کے رخسار کو چوم لیا ''آئی لو یو پاپا!''

''بس ہم کل ہی چلیں گے......''

☆☆☆☆☆

شہناز محسوس کر رہی تھی کہ کھیل ختم ہوتا جا رہا ہے!

عثمان دونوں بچوں میں گم ہو کر رہ گیا تھا اب وہ کبھی اس کی طلب نہیں کرتا تھا اسے شاید اس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ کم از کم لگتا وہی تھا اور یہ بہت بڑی ناکامی تھی۔ وہ تو جلنے اور تڑپنے کے بجائے پرسکون ہو گیا تھا۔

شہناز متوحش ہو گئی۔ یہ تو سب رائیگاں جا رہا تھا۔ عمر ہی رائیگاں جا رہی تھی۔ اس نے یہ تو نہیں سوچا تھا۔

وہ سوچتی رہی اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کی حکمت عملی ہی ٹھیک نہیں تھی۔ اس میں کچا پن تھا۔ کسی چیز

سے محرومی کا بھرپور احساس تو اس وقت ہوتا ہے' جب اس کی افادیت پوری طرح روشن ہو۔ جس شخص نے کبھی سیر ہو کر پانی ہی نہ پیا ہو' اس کی تشنگی تو بس واجبی سی ہوگی۔ پہلے آدمی پر یہ تو ثابت کیا جائے کہ کوئی نعمت کتنی بڑی ہے۔ اس کے بعد وہ محروم ہوگا تو عمر بھر پچھتائے گا۔ اس نے عثمان کو ابتدا ہی سے لذت سے محروم کر کے غلطی کی تھی۔ تبھی تو بچوں نے اس کی محرومی کی بہ آسانی تلافی کر دی تھی۔

اس نے اپنی حکمت عملی درست کرنے کا فیصلہ کر لیا!

اسے لگتا تھا کہ یہ کام مشکل ثابت ہوگا جس طلب سے کسی نے سمجھوتا کر لیا ہو' اسے جگانا آسان نہیں ہوتا لیکن وقت آنے پر اسے معلوم ہوا کہ عثمان نے سمجھوتا نہیں کیا تھا بلکہ وہ غیر معمولی ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا جبکہ ضبط ترغیب کے خلاف بہت کمزور ثابت ہوتا ہے اور ضبط بھی وہ جو فطرت پر کیا جا رہا ہو۔

اس کے ہاتھوں کے پہلے ہی لمس نے عثمان کو پگھلا دیا۔ وہ اس پر یوں برسی جیسے برسوں کے تپتے پیاسے صحرا پر موسلا دھار بارش مگر صحرا کی پیاس کہاں بجھتی ہے۔ وہ تو اور بھڑک جاتی ہے۔ صحرا تو سیلاب پی جائے' پھر بھی خشک ہی رہتا ہے ہاں وہ شکر گزار ضرور ہوتا ہے۔

وہ صحرا کو طوفانی بارش پلا کر اسے عادی بنا رہی تھی۔ اس کیلئے اس کے ذہن میں ایک عرصہ تھا۔ اس کے بعد صحرا کے آسمان پر بس چھوٹی چھوٹی بدلیاں رہ جاتیں۔ بدلیاں' جو صرف پیاس بڑھاتی ہیں' برستی کبھی نہیں۔ پیاس کبھی نہیں بجھاتیں۔ وہ بدلیوں کو پکارتا ہے' ان سے التجا کرتا ہے لیکن اپنی پیاس کی دیوار سے سر ٹکرا کر لہولہان ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

وہ جانتی تھی کہ بھڑکی ہوئی پیاس کے ہاتھوں تڑپتا صحرا ہر بہتے ہوئے سیال کو آب رواں سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ وہ زہر ہو کہ تیزاب' اس کے حلق میں ابھرے کانٹوں کو اس سے غرض نہیں ہوتی یہ تو اسے بعد میں پتا چلتا ہے کہ اس نے اپنے لیے کیسا عذاب...... کیسی موت خریدی ہے۔

وہ بہت خوش تھی۔ وقت کی باگیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ انہیں کھینچنے ہی والی تھی!

☆☆☆☆☆

''......میاں بیوی کا رشتہ دنیا کا سب سے سچا' سب سے پکا اور سب سے قریبی رشتہ ہوتا ہے......''

مسز شمیم کی تقریر جاری تھی۔

آدمی چند لمحوں میں کتنا کچھ سوچ سکتا ہے۔ پوری زندگی بھی دہرا لیتا ہے۔ عثمان حفیظ نے حیرت سے سوچا لیکن اب وہ کیا کرے۔ اس کی سوچ اور یادیں زندگی کے جس مقام تک پہنچ گئی تھیں' وہ ناگفتہ بہ تھا۔ اسی لیے سوچوں کا' یادوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا اور حال کے لمحے سے مسز شمیم کی آواز اس کی سماعت میں در آئی تھی۔

اس نے سوچا' دنیا میں کون ایسا ہوگا' جو پوری سچائی کے ساتھ اپنی پوری زندگی دہرا سکے۔ اتنا ظرف انسان میں کہاں ہوتا ہے اور اتنی صاف زندگی بھی کون گزارتا ہے۔ کون اپنے باطن کو تھال میں سجا کر پوری دنیا کے' لوگوں کے ملاحظے کیلئے لے کر نکل سکتا ہے۔ یہ تو صرف پیغمبروں اور ولیوں کیلئے ہی ممکن ہے۔

ہر انسان کے ساتھ ایسی یادیں‘ ایسے راز ہوتے ہیں‘ جنہیں وہ دوسروں پر نہیں کھول سکتا بلکہ ہر کسی کے ساتھ ایسے معاملات بھی ہوتے ہیں‘ جن پر وہ خود سے بھی بات نہیں کر سکتا جن کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ جنہیں وہ ساری عمر ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھولنے کی کوشش کرتا ہے۔

عثمان حفیظ کے سامنے بھی زندگی کے وہ صفحات آ گئے تھے‘ جنہیں وہ خود بھی نہیں پڑھنا چاہتا تھا لیکن انہیں زندگی کی کتاب سے نکالنا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ ایسی یادوں کیلئے کمپیوٹر سے کہیں زیادہ پیچیدہ‘ اللہ کی تخلیق انسانی دماغ کا ایک حصہ خودکار سنسر کا کام کرتا ہے۔ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے لیکن مکروہ حقیقتیں چھپانا ہی پڑتی ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چھپانے سے حقائق مٹتے نہیں لیکن......

مسز شمیم کی آواز سے...... حال سے اس کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا اب وہ پھر زندگی کی کتاب پڑھ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

ازدواجی زندگی کے سات سال گزر چکے تھے۔ خواب بکھر چکے تھے۔ طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ایسا پیاسا تھا جو پینے کے نام پر زہر بھی پی سکتا تھا۔ محرومیوں‘ ناآسودگیوں اور روح کے ناسوروں سے گھبرا کر اس نے جسم و جاں کیلئے نئے مشغلے ڈھونڈ لیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ گھٹیا ہو گیا ہے۔ ذلت کی گہرائیوں میں گرتا چلا جا رہا ہے۔

شراب اور عورت۔ یہ اس کے نئے ساتھی تھے لیکن یہ سب مشغلے دن کے تھے۔ اس کی شامیں اب بھی اپنے بچوں کیلئے وقف تھیں۔ اس کا دن آسودگی کی جستجو سے شروع ہوتا اور مدہوشی کے کرب کے ساتھ ختم ہوتا۔ شام اس کیلئے حقیقتاً آسودگی لیے آتی۔ بچوں کے ساتھ وہ بہت خوش رہتا لیکن رات اس کیلئے کانٹوں کی سیج بن جاتی۔ رات اپنے ساتھ ایسے عذاب لاتی کہ اسے رات سے خوف آنے لگا تھا پھر یوں ہوا کہ اس نے رات کو گھر میں بھی پینے کا معمول بنا لیا۔

وہ خوب عیاشی کر رہا تھا۔ وہ اس کا متحمل ہو سکتا تھا۔ دفتر سے اس کا تعلق برائے نام رہ گیا تھا۔ ابو کے وفادار ملازم اعتبار کے لوگ تھے۔ کاروبار اس کی بے پروائی کے باوجود نہ صرف چل رہا تھا بلکہ پھل پھول بھی رہا تھا۔ وہ تو اب صرف ضروری کاغذات اور چیکس پر دستخط کرتا تھا۔

اپنی عیاشی کیلئے اس نے شہر کے پرسکون علاقے میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ وہ ایسا علاقہ تھا‘ جہاں کسی کو کسی پر نظر رکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی وہاں پڑوسی کو پڑوسی کا علم نہیں ہوتا تھا۔ وہ صبح دفتر کے ضروری کام نمٹاتا اور اس فلیٹ کا رخ کرتا وہاں اس کیلئے شراب بھی ہوتی اور ہر روز ایک نئی عورت بھی۔ شہر میں کال گرلز کی کمی تو نہیں تھی۔

کچھ بھی سہی‘ ایک خیال نشے میں بھی اس کے دماغ میں ڈنک گاڑتا رہتا تھا۔ وہ سوچتا...... یہ میں ہوں......! عثمان حفیظ! میں اور ایسا......! یہ سب شہناز کی مہربانی ہے۔ میں نے تو اس سے محبت کی تھی۔ یہ اس نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ کیسی محرومیاں دیں اس نے مجھے۔ کیسے زخم لگائے۔ کیسے داغا

میری روح کو۔ میں کتنا گر گیا ہوں۔ کیا محبت اتنی بری چیز ہے۔ کیا کمی تھی میری محبت میں۔ کیوں اس طرح ذلیل کیا اس نے مجھے۔

وہ یہ سب کچھ سوچتا اور ہر لمحے شہناز سے اس کی نفرت میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ ایسی نفرت نہیں تھی کہ محبت کی صورت مسخ ہوئی ہو اور اس نے نفرت کا چہرہ اوڑھ لیا ہو۔ وہ کچلی ہوئی محبت نہیں تھی۔ وہ اصلی اور خالص نفرت تھی۔ محبت کی عمارت جل کر راکھ ہوئی تھی اور اس کی جگہ نفرت تعمیر ہوئی تھی۔

کتنا ہی چھپایا جائے‘ جہاں آگ لگی ہو‘ وہاں سے دھواں اٹھتا ہی ہے۔

ایک دن شہناز نے اس سے پوچھ ہی لیا ”سنا ہے‘ آپ پینے لگے ہیں؟“

”درست سنا ہے تم نے۔“

”کب سے؟“

”مدتیں ہو گئیں اب تو۔ میں تو گھر میں بھی پیتا ہوں۔“

شہناز کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا ”اور مجھے معلوم بھی نہیں؟“

”تمہیں مجھ سے غرض ہی کیا ہے‘ جو معلوم ہو۔ تمہیں مجھ میں دلچسپی ہی کب ہے۔“

”اور سنا ہے‘ آپ کی زندگی میں عورتوں کی بھی کمی نہیں۔“

”یہ بھی ٹھیک سنا ہے تم“ اس نے بے پوائی سے کہا۔

”آپ اپنے باپ کی محنت سے کمائی ہوئی دولت یوں اڑا رہے ہیں...... کال گرلز پر۔ ان میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“

”ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں‘ جو تم میں ہیں“ عثمان نے زہریلے لہجے میں کہا ”اور اضافی خوبیاں بھی ہیں مثلاً وہ موڈ کی پابند نہیں ہوتیں۔ انکار نہیں کرتیں۔ برف کی سل ثابت نہیں ہوتیں اور یہ کہ وہ ضرورتاً خود کو فروخت کرتی ہیں۔“

”اب آپ مجھے الزام دیں گے۔“

وہ اس پر الزام ثابت کر سکتا تھا لیکن نفرت ایسی تھی کہ وہ اسے اپنی تباہی کا کریڈٹ بھی نہیں دینا چاہتا تھا ”تمہیں کیوں الزام دوں۔ میں تم سے ڈرتا ہوں کیا۔ میں تو یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ یہی میرا اصل چہرہ ہے۔ بہت دن نقاب ڈال کر جی لیا اب منافقت نہیں چلے گی۔ سیدھی سی بات ہے میرے پاس دولت ہے تو عیاشی کیوں نہ کروں؟“

”مجھے ڈرتے نہیں تو مجھے خود سے کیوں نہیں بتایا‘ گھر میں چھپ کر کیوں پیتے رہے؟“

”تم سے نہیں ڈرتا۔ بچوں کا...... خاص طور پر نومی کا خیال رہتا ہے۔“

شہناز کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نظر آئی ”اوہ...... یہ بات ہے۔ مجھے سمجھ لینی چاہیے تھی“ پھر اس کے تیور بدل گئے ”مجھے آپ کی عیاشی پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک بات سن لیں۔ آپ گھر میں کبھی شراب نہیں پئیں گے۔“

یہ وہ وقت تھا جہاں عثمان کو وہ مضبوطی دکھانا تھی، جو اس کے اندر نہیں تھی۔ یہ جنگ تو وہ اپنے آپ سے مہینوں پہلے لڑ چکا تھا اور ہار گیا تھا۔ بچوں کی...... اور خاص طور پر ثوبیہ کے مستقبل کی خاطر ضروری تھا کہ ان کی ازدواجی زندگی جاری رہے۔ وہ اپنے بچوں کو منقسم انسان نہیں بنانا چاہتا تھا۔ پھر وہ شہناز کو طلاق دیتا تو اس سے معاشرے میں بچوں کی پوزیشن متاثر ہوتی۔ وہ نکو بن کر رہ جاتے اور یہ بھی ضروری تھا کہ شہناز کو اس کی اس سوچ کا علم نہ ہو بلکہ اس پر بالکل برعکس تاثر نقش کیا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ شہناز کو اس کی اس کمزوری کا علم ہو گیا تو وہ اسے بلیک میل کرے گی۔ اس کی زندگی عذاب بنا دے گی۔

اس نے فوراً ہی اس موقع سے فائدہ اٹھایا ''یہ میرا گھر ہے یہاں میں جو چاہوں گا، وہی کروں گا۔'' اس نے اکڑ کر کہا۔

''یہ میں برداشت نہیں کروں گی۔'' شہناز نے کڑے لہجے میں کہا۔

''نہ کرو'' عثمان نے بے پروائی سے کہا ''اس گھر کے دروازے بند نہیں ہیں، تم یہاں قید نہیں ہو اور تمہارے پاپا بخوشی تمہیں افورڈ کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔''

شہناز سناٹے میں آ گئی۔ یہ تو اس کے خواب وخیال میں بھی نہیں ہو گا کہ وہ ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ بہرحال اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا ''واقعی...... یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں لیکن میں بچوں کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔''

''موسٹ ویلکم'' عثمان نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا ''تم انہیں رکھو یا مجھے دے دو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں لے جاؤ گی تو میرے لیے اور سہولت ہو جائے گی۔ میں وہ سب کچھ گھر پر بھی کر سکوں گا، جس کیلئے مجھے ایک مہنگا فلیٹ کرائے پر لینا پڑا ہے اور چھوڑ جاؤ گی تو بھی کوئی بات نہیں۔ یہ سیٹ اپ چلتا ہی رہے گا'' وہ کہتے کہتے رکا ''شہناز بیگم، تم مجھے سات سال پہلے والا عثمان سمجھنے کی غلطی مت کرو۔ آئندہ میرا تجزیہ نئی روشنی میں کرنا ورنہ پچھتاؤ گی'' اس نے سرد لہجے میں اضافہ کیا۔

''یہ ہے آپ کی وہ محبت، جس کے افسانے......''

''ایک منٹ۔ خوب یاد دلایا'' عثمان نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی ''آؤ میرے ساتھ'' وہ سوچ رہا تھا، یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ آدمی کو جو کہنا ہو وہ کہہ نہیں سکتا اور اس کے بجائے کچھ اور کہنا پڑتا ہے۔ ''محبت تو ضرورت کے تحت ہوتی ہے شہناز بیگم اب تم میری ضرورت ہی پوری نہیں کرتیں تو محبت کیسی؟'' وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ ''آج کل تو میں بازاری عورتوں سے محبت کر رہا ہوں۔''

وہ شہناز کو خواب گاہ میں لے گیا، جیسے وہ مہینوں سے بھولا ہوا تھا۔ وہ سیدھا بلوری تاج محل کی طرف گیا اور زور لگا کر اسے اسٹینڈ سے کھسکانے لگا۔ بلور کا وہ تاج محل اس کی توقع سے زیادہ بھاری تھا اس

لیے چھناکا بھی بہت زوردار تھا۔ ''سوری شہناز بیگم! اس علامت کو تو مجھے اسی وقت مٹا دینا چاہیے تھا، جب تمہاری محبت ختم ہوئی تھی۔ خیر اب سہی۔ امید ہے وہ گھڑی تم خود ہی پھینک دو گی'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا ''اب محبت کی اس علامت کو کوڑے کے ڈھیر پر پھنکوا دینا اور اس وقت تک اس کمرے میں ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر چلنا۔''

شہناز پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹوٹے ہوئے تاج محل کو دیکھ رہی تھی۔ بہت باریک کرچیاں، بہت دور تک پھیلی تھیں۔ بڑے ٹکڑے اسٹینڈ کے پاس ہی پڑے تھے۔ تو یہ ہوتی ہے محبت؟ اتنی نازک، اتنی غیر محفوظ؟ وہ سوچ رہی تھی لیکن اس کے دل میں دکھ کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

''گڈ نائٹ'' عثمان نے کہا اور خواب گاہ سے نکل آیا۔ یہ بات اس کیلئے خوشی اور طمانیت کا باعث تھی کہ تاج محل توڑتے وقت نہ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی نہ اس کے دل میں کوئی ٹیس اٹھی تھی۔ وہ اس پر بھی بہت خوش تھا کہ اس کا بلف کارگر ثابت ہوا۔ اب اسے شہناز کی رف سے کبھی پریشانی نہیں ہو گی۔

اس رات بہت مدت کے بعد ایسا ہوا کہ وہ سکون سے سویا۔

☆☆☆☆☆

شہناز نے جو سوچا تھا، اس کے مطابق عمل کیا۔ اس نے ایک سال میں عثمان کو اپنی لت لگا دی۔ اس نے اپنا آپ اس پر نچھاور کر دیا۔ قربت میں اس کے انداز میں وارفتگی اور محبوبیت ہوتی۔ وہ ازمنہ وسطیٰ کی کوئی شاہی کنیز بن گئی، جسے شہنشاہ کو خوش کرنے کے تمام گر آتے تھے۔

پھر اچانک اس نے خوشیوں کی طنابیں کھینچ دیں۔ پرتکلف مرغن کھانوں کا عادی عثمان اب بھوکا تھا۔ وہ اس کے خوان بدن کا عادی ہو چکا تھا مگر دسترخوان سمیٹا جا چکا تھا۔ وہ بہت سکون سے اسے ٹوٹتے، بکھرتے دیکھتی رہی۔ اس کی ریزگی میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ چڑچڑا اور بدمزاج ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی نیند پوری نہیں ہوتی تھی بلکہ بعض اوقات تو وہ رات بھر نہیں سو پاتا تھا۔ اس کا اثر اس کی صحت پر پڑ رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

پھر ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ نسبتاً پرسکون نظر آنے لگا۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس سے کھنچ بھی گیا تھا لیکن یہ فطری ردعمل تھا البتہ شہناز کو یہ پریشانی ضرور تھی کہ ریزگی کا عمل کیوں رک گیا ہے۔

ایک ٹیلی فون کال نے اس کی یہ الجھن بھی دور کر دی۔ اسے پتا چل گیا کہ ریزگی کا عمل رکا نہیں، اس نے جہت تبدیل کر لی ہے اور اس کی رفتار بڑھ گئی ہے۔

اس روز ڈیڑھ بجے فون کی گھنٹی بجی تو اس نے ریسیور اٹھایا۔ ''ہیلو!''

''جی مجھے مسز عثمان سے بات کرنی ہے'' دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز نے کہا۔

''میں بول رہی ہوں۔ آپ کون ہیں؟''

''بی بی...... میں ساجد علی بات کر رہا ہوں۔''

''کون ساجد علی؟''

''آپ کی فرم کا منیجر۔ آپ بھول گئیں مجھے؟ آپ کے گھر کو ہم نے ہی سجایا تھا۔ ہمیں شادی سے پہلے ہی صاحب نے گھر بلا لیا تھا......''

''ہاں...... یاد آ گیا۔ کیسے ہیں آپ؟ شہناز نے خشک لہجے میں کہا'' صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔''

''جی...... میں جانتا ہوں۔ مجھے آپ ہی سے بات کرنا تھی۔''

''مجھ سے؟ کس سلسلے میں؟ آپ جانتے ہیں' میں کاروباری معاملات میں نہیں پڑتی۔''

''کاروباری بات نہیں ہے بیگم صاحبہ! مجھے آپ کو بہت ضروری...... لیکن بہت مشکل بات بتانی ہے' آواز سے ہچکچاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

شہناز کو الجھن ہونے لگی'' بھئی آپ پہیلیاں نہ بجھوائیں' صاف بات کریں۔''

''بات یہ ہے بیگم صاحبہ کہ ہم بڑے صاحب کے زمانے کے نمک خوار ہیں۔ خیر خواہی ہمارا فرض ہے۔ آپ کے سوا کوئی نہیں' جس سے بات کر سکیں۔ عثمان صاحب نے کاروبار پر توجہ دینا چھوڑ دیا ہے۔ اس سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ وہ غلط سمت میں چل پڑے ہیں۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' شہناز نے ترش لہجے میں پوچھا۔

''بتاتے ہوئے دکھ بھی ہو رہا ہے اور افسوس بھی لیکن بتانا ضروری ہے۔ عثمان صاحب کو امیروں والے شوق لاحق ہو گئے ہیں۔''

''وضاحت کیجیے ساجد صاحب۔''

''صاحب پینے لگے ہیں اور عورتوں کا چکر بھی چل گیا ہے۔ دفتر میں سب پریشان ہیں۔ عثمان صاحب ایسے تھے نہیں۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے انہیں۔ ہم لوگ تو کچھ نہیں کر سکتے اس لیے آپ کو صورتحال بتا دی ہے۔''

''آپ کا شکریہ ساجد صاحب۔ میں دیکھوں گی کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔ اب تک تو مجھے علم ہی نہیں تھا' اچھا خدا حافظ۔''

اس رات شہناز نے عثمان سے بات کی۔ اسے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اب ایک بدلا ہوا آدمی ہے۔ اس رات عثمان نے وہ تاج محل توڑ ڈالا' جسے اس نے سہاگ رات کو اس کیلئے اپنی محبت کی علامت قرار دیا تھا۔ وہ شہناز کیلئے بہت بڑا دھچکا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے اس تاج محل سے یا عثمان کی محبت سے کوئی دلچسپی تھی۔ ملال اس بات کا تھا کہ وہ اس کے ٹرانس سے پوری طرح نکل چکا تھا بلکہ شاید اب وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ بہر کیف اب وہ اس کے قابو میں بالکل نہیں رہا تھا۔ اس کا اندازہ اسے کچھ دیر پہلے

اس وقت ہو گیا تھا' جب عثمان نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ چاہے تو اس سے طلاق لے سکتی ہے۔ چاہے تو بچے بھی ساتھ لے جائے۔ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں بڑی سفاکی تھی۔

شہناز کو اس ازدواجی زندگی میں ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اسی وقت گھر چھوڑ دیتی۔ نعمان سے تو اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ثوبیہ سے وہ دور نہیں رہ سکتی تھی اگر اس نے عثمان کی آزادی کی پیشکش کو قبول نہیں کیا تھا اس کی ایک وجہ ثوبیہ ہی تھی وہ سمجھتی تھی کہ معاشرے میں مطلقہ ماں کی بیٹی کو تمام تر خوبیوں کے باوجود عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کا سوسائٹی میں کوئی اچھا مقام نہیں ہوتا۔ اسے اچھا رشتہ ملنا بھی دشوار ہوتا ہے اور شہناز کو ثوبیہ کا مستقبل بہت عزیز تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مشکور کی شادی ہو چکی تھی اور وہ جانتی تھی کہ وہ اب بھی اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہ امکان ہوتا تو وہ پہلے ہی عثمان کو چھوڑ چکی ہوتی۔

اس کا قیدی آزاد ہو چکا تھا' اس کا اسے افسوس تھا لیکن یہ اطمینان تھا کہ ایک اہم مقصد وہ حاصل کر چکی ہے۔ اس لیے وہ اگلے روز ممی سے ملنے گھر چلی گئی۔

''کیا بات ہے؟ بہت بجھی بجھی نظر آ رہی ہو؟'' ممی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

اس وقت وہ بہت اچھی اداکاری کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

''کیا بات ہے' تم رو کیوں رہی ہو؟'' ممی نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

وہ ممی سے لپٹ گئی'' پاپا نے اور آپ نے مجھے جہنم میں جھونک دیا ممی' وہ سسکنے لگی۔

''کیا ہوا؟ بات کیا ہے؟'' ممی متوحش ہو گئیں۔

اس نے ساجد علی کی فون کال سے لے کر عثمان سے گفتگو تک سب کچھ من و عن بتا ڈالا'' اب آپ بتائیے۔ جن برائیوں کی وجہ سے پاپا نے مشکور کو مسترد کیا تھا' وہی برائیاں عثمان میں بھی نکل آئیں۔ مشکور سے میری شادی ہو گئی ہوتی تو میں شکایت نہ کرتی کہ وہ میرا فیصلہ تھا اب پاپا کیا جواب دیں گے مجھے؟ میں نے یہ سب کچھ انہیں اس لیے نہیں بتایا کہ میں انہیں اپنے سامنے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ اب وہ بتائیں کہ ان کی مردم شناسی کیا ہوئی؟''

فہمیدہ بیگم سکتے کی سی حالت میں بیٹھی تھی'' یقین نہیں آتا کہ عثمان ایسا ہو سکتا ہے'' وہ بڑبڑائیں۔

''پاپا سے کہیں' اس کے دفتر جا کر ساجد صاحب سے پوچھ لیں۔''

''لیکن اتنے برسوں کے بعد ایسا کیوں ہوا؟'' فہمیدہ بیگم کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

''اس نے خود مجھ سے کہا کہ یہی اس کا اصل روپ ہے۔'' شہناز نے تند لہجے میں کہا'' سات سال وہ چہرے پر پارسائی کا نقاب اوڑھے منافقت کرتا رہا لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اس نے مجھے بہت ذلیل کیا ممی۔ کہنے لگا کہ چاہو تو طلاق لے لو۔ تمہارے پاپا تمہیں افورڈ کر سکتے ہیں۔''

''یقین نہیں آتا۔ اتنے برسوں کے بعد کیوں......؟ کوئی سبب تو ہو گا'' فہمیدہ بیگم کے لہجے سے بے یقینی نہیں جا رہی تھی۔

'' آپ کے خیال میں' میں جھوٹ بول رہی ہوں'' اس نے چڑ کر کہا۔

'' میں یہ تو نہیں کہہ رہی ہوں'' فہمیدہ بیگم نے مدافعانہ لہجے میں کہا '' تم پاپا کو بھی یہ سب کچھ بتانا۔''

'' میں اب گھر واپس جا رہی ہوں۔ پاپا کو آپ ہی بتا دیجیے گا ان کی مردم شناسی کے متعلق۔''

ممی اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ اس کا لہجہ بہت خراب تھا۔

☆☆☆☆☆

عثمان مطمئن تھا کہ شہناز کی طرف سے اب اسے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ کوئی نیا مسئلہ نہیں کھڑا ہوگا۔ وہ اب تک جو کچھ کر چکی ہے' وہی اس کیلئے بہت ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس بار اس نے دباؤ ڈالا ہے۔ اسے کچل کر رکھ دیا ہے اسے سب سے زیادہ علیحدگی کا خوف تھا۔ اپنی ازدواجی زندگی قائم رکھنے کیلئے اس نے بے پناہ اذیت سہی تھی۔ بدترین عذاب اپنے اندر اٹھائے گھوم رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔ اس لیے اس نے اس معاملے میں بے پروائی لادی تھی۔ اس نے شہناز کو یہ تاثر دیا تھا کہ اسے اپنے بچوں کی' ازدواجی زندگی کی اور معاشرے میں اپنے اور بچوں کے مقام کی کوئی پروا نہیں۔

لیکن اس کا یہ اطمینان وقتی ثابت ہوا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ شہناز کسی بھی زاویے سے کوئی وار کر سکتی ہے۔ اسے بس اس کی کوئی کمزوری معلوم ہو جائے۔ کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا ہنر اسے خوب آتا ہے۔

اس شام وہ بچوں کے ساتھ لان میں بیٹھا تھا۔ اچانک نعمان نے اس سے پوچھا '' پاپا...... شراب بہت بری چیز ہوتی ہے؟''

اسے شاک لگا۔ وہ اپنے بیٹے کے معصوم چہرے کو تکتا رہ گیا۔ اسکا بیٹا اب آٹھ سال کا ہونے والا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سات سال کی عمر کتنی نازک ہوتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے' جب بچہ معصومیت کی دہلیز پر کھڑا شعور اور آگہی کی طرف پہلا قدم بڑھا رہا ہوتا ہے وہ سمجھ داری کے دور میں داخل ہونے والا ہوتا ہے اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ہے کہ اس عمر میں بچوں کو نماز سکھائی جائے۔ نماز پڑھنے کی تلقین کی جائے۔ تلقین سے کام نہ چلے تو سختی کی جائے تاکہ سن شعور کا آغاز دین کے ساتھ ہو۔

اور یہاں اس عمر میں اس کا بچہ شراب کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اسے خود سے شرم آنے لگی۔ غصے سے اس کا خون کھول اٹھا۔

'' آپ نے بتایا نہیں پاپا۔'' نعمان نے کہا۔

'' ہاں بیٹے۔ شراب بری نہیں...... بہت بری چیز ہے۔'' عثمان نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ اللہ کے حکم کا حوالہ نہیں دیا اس لیے کہ وہ خود شراب پیتا تھا۔

'' میں نہیں مانتا پاپا کہ شراب بری چیز ہوتی ہے'' نعمان کے لہجے میں یقین تھا۔

عثمان نے گھبرا کر ثوبیہ کو دیکھا' جو پوری توجہ سے یہ گفتگو سن رہی تھی۔ '' ثوبی بیٹا' بھاگ کر اندر جاؤ

اور ثریا سے چائے بنوا کر لاؤ۔ چائے خود لے کر آنا میرے لیے'' اس نے کہا۔

'' پاپا...... میں کہہ کر آجاؤں۔ چائے انا خود لے آئیں گی'' پانچ سالہ ثوبیہ نے کہا۔

'' نہیں بیٹی۔ چائے تمہیں لے کر آنا۔ تمہارے ہاتھ لگیں گے تو چائے اچھی ہو جائے گی۔ جاؤ بیٹا'' اس نے چمکارا۔

ثوبیہ خوش ہو گئی'' ابھی لاتی ہوں پاپا'' اس نے چہک کر کہا اور گھر میں چلی گئی۔

عثمان اب نومی کو گھور رہا تھا'' یہ جو تم نے کہا کہ تم شراب کو بری چیز نہیں مانتے' اس کا کیا مطلب ہے؟'' اس کا لہجہ سخت تھا۔

'' میں سمجھتا ہوں پاپا کہ شراب بری نہیں' اچھی چیز ہوتی ہے۔''

عثمان کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی'' یہ بے ہودہ بات کیسے سوچی تم نے؟''

'' ایک بات بتائیں پاپا۔ آپ شراب پیتے ہیں؟''

وہ الجھن میں پڑ گیا۔ یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی...... اور کیسے؟ اب کیا بتائے اسے؟

'' اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے پاپا'' اس کے بیٹے نے بے حد معصومیت سے کہا۔

'' ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹے میں بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' اس نے فیصلہ کر لیا'' ہاں...... میں شراب پیتا ہوں بیٹے'' اس کا سر جھک گیا۔ شرمندگی کا احساس پہلی بار ہوا تھا'' لیکن تمہیں یہ بات بتائی کس نے؟''

'' مما نے بتائی تھی اور میں نے مما سے کہہ دیا تھا کہ میرے پاپا شراب پیتے ہیں تو شراب بری چیز نہیں ہوگی۔ مما کہنے لگیں' شراب تو ہوتی ہی بری ہے۔''

عثمان کا خون پھر کھولنے لگا۔ وہ اس لمحے کو کوس رہا تھا' کب اس نے شہناز کے سامنے اس کمزوری کا اعتراف کیا تھا کہ وہ اس سے نہیں ڈرتا لیکن بچوں کو بچانا چاہتا ہے۔ کم ظرف عورت نے وار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی'' مما ٹھیک کہتی ہیں بیٹا'' اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

'' میں نہیں مانتا' میں نے مما سے کہہ دیا تھا کہ بڑا ہو کر میں بھی شراب پیوں گا۔''

'' کیوں کہی تم نے یہ بات؟'' وہ غرایا۔

'' میں آپ جیسا بننا چاہتا ہوں پاپا' آپ تو ہیرو ہیں۔''

عثمان کو احساس ہوا کہ بچے پر غصہ کرنا جائز نہیں۔ اس کا اس میں کیا قصور۔ قصور تو اس کا اور شہناز کا ہے بلکہ درحقیقت اس کا اپنا ہے'' بیٹے۔ میں انسان ہوں' انسان کبھی خامیوں سے' برائیوں سے پاک نہیں ہو سکتا۔ تمہیں مجھ جیسا نہیں بننا چاہیے۔ ویسا بننا چاہیے' جیسا اللہ نے حکم دیا ہے'' وہ نرم لہجے میں کہتا رہا۔

'' اللہ کا ہر حکم سچا' اس کی ہر بات برحق۔ اللہ نے شراب کو بہت بری چیز قرار دیا ہے۔ حرام' گندی' غلیظ۔ سمجھے بیٹے' تو میں کوئی برا کام کروں تو وہ میرے کرنے کی وجہ سے اچھا نہیں ہو جائے گا' برا ہی رہے گا۔''

ننھا نومی کچھ دیر سوچتا رہا۔ وہ جیسے کسی اندرونی کشمکش سے دوچار تھا پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا

مر پاپا...... میں تو آپ جیسا بننا چاہتا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے بیٹے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ ہر برائی چھوڑ کر اچھا بننے کی کوشش کروں گا" اس نے بلا جھجک کہا۔

"پرامس پاپا! نومی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"پرامس مائی سن" اس نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسی وقت ثوبیہ چائے لے آئی۔ وہ بہت سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھی۔ پھر بھی آدھی چائے ساسر میں چھلک چکی تھی۔ "شاباش میری بیٹی" اس نے بچی کے ہاتھ سے چائے لیتے ہوئے کہا۔

اس روز اسے احساس ہوا کہ اولاد کو نعمت عظمیٰ کیوں کہا جاتا ہے۔ اولاد انسان کو راہ راست پر لے آتی ہے۔ کم از کم وہ تو سیدھا ہو گیا تھا۔

اب یہ اس کا نصیب کہ تین دن بعد وہ اس وعدے کی قید سے آزاد ہو گیا۔

جمعرات کے دن فہمیدہ آنٹی سعود اور محمود کے ساتھ آ گئیں۔ اگلے روز حیدرآباد میں ان کے دور پرے کے کسی رشتے دار کے ہاں شادی تھی۔ وہ لوگ اس میں شرکت کیلئے جا رہے تھے۔ دعوت نامہ عثمان کو بھی ملا تھا اور آنٹی اصرار کر رہی تھیں کہ وہ لوگ بھی چلیں۔ شہناز نے صاف انکار کر دیا "میں تو نہیں جا سکتی ممی۔"

آنٹی نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا "اب کچھ نہیں ہو سکتا آنٹی۔ آپ اپنی بیٹی کو جانتی ہیں۔ انکار کے بعد یہ اقرار کر لیں تو بھی انکار ہی رہتا ہے۔"

"لیکن بیٹے" انہوں نے فون پر بھی بہت اصرار کیا تھا تم لوگوں کیلئے۔"

"مجھ سے بھی کیا تھا آنٹی لیکن اب کیا ہو سکتا ہے" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "ہاں بچے میری نمائندگی کر سکتے ہیں۔ آپ انہیں لے جائیں۔"

"بچے نہیں۔ آپ بس ان کے بیٹے کو لے جائیں۔ ان کی نمائندگی کیلئے وہی بہت کافی ہے۔ ثوبیہ کو میں نہیں بھیجوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم نومی کو تیار کر دو" آنٹی نے شہناز سے کہا اور شہناز نے آیا کو بلا کر نعمان کا بیگ تیار کرنے کی ہدایت دی۔

نعمان بہت خوش تھا کہ وہ حیدرآباد جا رہا ہے لیکن جب اسے پتا چلا کہ پاپا نہیں جا رہے ہیں تو وہ پھیل گیا "آپ بھی چلیں نا پاپا۔"

"سوری بیٹے۔ میں نہیں جا سکتا۔"

"تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گا۔"

"جاؤ گے کیسے نہیں اب تمہارا بیگ تیار ہو گیا ہے۔ تمہیں جانا پڑے گا" شہناز نے نعمان پر آنکھیں نکالیں۔

"میں پاپا کے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

عثمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور آخر میں قائل کر لیا "تم کیسے بیٹے ہو۔ کیا محبت کرتے ہو پاپا سے" اس نے ملامت بھرے لہجے میں کہا "پاپا کی بات تو مانتے نہیں۔"

"پاپا میں......"

"پلیز نومی میری خاطر چلے جاؤ۔"

"اچھا پاپا۔ جا رہا ہوں لیکن ایک شرط ہے اب کی چھٹیوں میں آپ ہمیں مری لے کر چلیں گے۔"

"منظور ہے۔"

نومی جا تو رہا تھا لیکن خوش نہیں تھا۔ عثمان جانتا تھا کہ وہ بس اس کے لحاظ میں جا رہا ہے۔ یہ اس کی بے پناہ محبت کا ثبوت تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن آنسوؤں کی چمک تھی۔ "ٹاٹا پاپا۔ گڈ بائی" جب تک کار نظر آتی رہی وہ ہاتھ ہلاتا نظر آتا رہا۔

وہ لوگ چلے گئے۔ ایک گھنٹے بعد فون پر اطلاع ملی کہ سپر ہائی وے پر ایک بدمست ٹرالر نے آنٹی کی ننھی منی سوزوکی کو روند ڈالا۔

ثوبیہ سو چکی تھی۔ اسے آیا کے پاس چھوڑ کر وہ اس ہاسپٹل گئے جہاں سے فون آیا تھا وہاں نجم انکل پہلے سے موجود تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر ان کے دل بیٹھنے لگے۔ انہوں نے اسے لپٹا لیا۔ "بیٹے صبر سے۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے" انہوں نے اسے تلقین کی لیکن ان کی اپنی آواز بکھری جا رہی تھی۔

وہ انہیں اسپتال کے ایک کمرے میں لے گئے "بیٹے...... صبر سے...... حوصلے سے" کمرے میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے پھر کہا۔

بیڈ پر لہولہان نعمان لیٹا تھا۔ اسے دیکھ کر تو شہناز بت بن کر رہ گئی۔ عثمان تیزی سے بیڈ کی طرف لپکا۔ "آپ اس سے بات کریں۔ دیکھیں پہچانتا ہے یا نہیں" ڈاکٹر نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

"آپ کچھ کرتے کیوں نہیں" عثمان ڈاکٹر پر الٹ پڑا "کیسے ڈاکٹر ہیں آپ...... دیکھیں اسے کچھ ہونا نہیں چاہیے۔"

"سوری عثمان صاحب۔ اللہ کی مرضی میں کسی کا دخل نہیں۔ ہم جو کر سکتے تھے کر چکے ہیں اب دعا کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

"آپ کا مطلب ہے......" عثمان سے بات پوری نہیں کی گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ڈاکٹر نے جواب نہیں دیا لیکن جواب اس کے چہرے پر صاف لکھا ہوا تھا۔ عثمان بے تابی سے بیٹے کے چہرے پر جھک گیا۔ نومی کی آنکھیں بند تھیں۔ سانس بھی ٹوٹ ٹوٹ کر اور مدھم مدھم چل رہی تھی

''نومی......نومی بیٹے۔ دیکھو یہ میں ہوں'' اس نے بیٹے کو پکارا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

تیسری بار پکارنے پر نومی نے بہت زور لگا کر آنکھیں کھولیں۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے تکتا رہا۔

''نومی...... بیٹے...... یہ میں ہوں...... تمہارا پاپا۔''

نومی کے ہونٹ ہلے۔ آواز بہت ہلکی عثمان نے اس کے ہونٹوں سے کان لگا دیئے ''پاپا...... سویٹ پاپا...... آئی لو یو۔ آپ بہت اچھے ہیں پاپا۔ آئی لو یو' بچہ ہانپنے لگا۔

''میرے بیٹے۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ میری تو پوری کائنات تم ہو۔'' اس نے پوری سچائی سے کہا۔

نومی اب کمزور آواز میں ماں کو پکار رہا تھا۔ ''مما...... مما...... مما'' عثمان نے پلٹ کر دیکھا۔ شہناز دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ وہ صدمے سے شل ہو رہی تھی۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا پورا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

''شہناز...... یہ تمہیں بلا رہا ہے۔'' عثمان نے رندھی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔

شہناز بیڈ کے پاس آ گئی۔ نومی پر جھک گئی۔

''نومی...... یہ آ گئیں تمہاری مما'' عثمان نے کہا۔

بچے کی ڈوبتی آنکھوں میں چمک سی ابھری پھر اس کی نگاہیں دھندلا گئیں ''مما...... مما...... آپ مجھے گود میں کیوں نہیں لیتیں؟'' وہ آٹھ سالہ نومی کی نہیں' چھوٹے بچے کی آواز تھی۔ عثمان اسے پہچان سکتا تھا...... یاد کر سکتا تھا۔ وہ برسوں پہلے کے نومی کی آواز تھی' جب وہ بہت چھوٹا تھا۔

شہناز نے بچے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ عثمان اس پر جھکا ہوا تھا ''آئی...... لو...... یو پاپا......'' نومی نے بمشکل کہا۔ اسی لمحے ہچکی آئی اور سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی۔

یہ تو انہیں بعد میں پتا چلا کہ آنٹی' سعود اور محمود پہلے ہی جا چکے تھے۔ بوڑھے نجم الحسن نے جس وقت اسے صبر اور حوصلے کی تلقین کی تھی' اس وقت وہ خود پہاڑ جیسے صبر اور حوصلے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان کی تو کائنات لٹ چکی تھی۔ ان کیلئے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

اس غم نے عثمان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ زندگی کا بہت مضبوط سہارا چھن گیا تھا اس سے۔ رات کو دکھ اور اذیت کے کانٹے اسے چبھتے تو وہ نومی سے لپٹ کر سو جاتا تھا۔ اب وہ بستر ہی خالی ہو گیا تھا۔ سیج اس کی بہت پہلے اجڑ گئی تھی اب بستر بھی اجڑ گیا تھا' اب وہ کیا کرے گا۔

شام آتی تو اس کا دل ہولنے لگتا۔ برسوں سے اس کا شام کا معمول تھا کہ شام بچوں کے ساتھ گزرتی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جو ہر روز اسے خوشگواریت کا احساس دلاتا تھا۔ بڑے سے بڑے دکھ اور پریشانی میں بھی یہ لمحے اسے جینے کا حوصلہ اور توانائی دیتے تھے اب وہ شام کو لان میں بیٹھتا تو صرف ثوبیہ کی خاطر اور اس کے معصوم سوالات اس کا دکھ اور بڑھا دیتے۔

''پاپا...... بھائی کہاں گئے؟'' وہ پوچھتی ''بھائی کو بلائیں پاپا۔''

''بیٹا...... بھائی اب نہیں آئے گا۔ اسے اللہ میاں نے اپنے پاس بلا لیا'' وہ رندھے ہوئے گلے سے کہتا۔

''تو اللہ میاں نے مجھے کیوں نہیں بلایا۔ بھائی تو میرے بغیر کھیلتے بھی نہیں تھے۔''

وہ کچھ جواب نہ دے پاتا۔ چپ چاپ آنسو بہاتا رہتا۔

''پاپا...... آپ مجھے بھی اللہ میاں کے پاس بھیج دیں۔ میں بھائی کے پاس جاؤں گی۔''

''تو بیٹی' یہاں پاپا کے پاس کون رہے گا پھر اکیلا چھوڑ دو گی ہمیں؟''

''اچھا پاپا' میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ آپ رو کیوں رہے ہیں؟''

''تم ایسی باتیں جو کرتی ہو۔''

پانچ سالہ بیٹی ایک دم بڑی ہو جاتی۔ وہ اپنی فراک کے دامن سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے چمکارتی ''اچھے بچے روتے نہیں ہیں۔ ہے نا پاپا۔''

نومی کی وجہ سے اس نے توبہ کی تھی۔ جو تین دن اسے ملے تھے' اس نے نہ شراب کو ہاتھ لگایا تھا' نہ ہی فلیٹ کا رخ کیا تھا۔ بیٹے سے وعدہ جو کیا تھا اس نے...... لیکن نومی ہی کی وجہ سے اسے پرانی راہوں پر جانا پڑ گیا۔ دکھ اور اذیت اس کیلئے ناقابل برداشت ہو گئے تھے پھر یہ خیال بھی تھا کہ جس کی خاطر سب کچھ چھوڑا تھا' جب وہی چھوڑ گیا تو اب کیسا لحاظ۔

اس کی مے نوشی صرف دوبارہ شروع نہیں ہوئی' پہلے سے بڑھ گئی۔ وہ ہر دکھ' ہر پریشانی' ہر اذیت کو شراب میں ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اذیت تو اور بڑھ جاتی تھی۔ نشے میں وہ عجیب انداز میں سوچنے لگا۔ نومی کی موت کا ذمے دار وہ تھا۔ نومی تو نہیں جانا چاہ رہا تھا۔ وہ تو صرف اس کے لحاظ میں...... اسے خوش کرنے کیلئے گیا تھا۔ جاتے ہوئے وہ افسردہ تھا۔ اسے اس کی وہ آخری جیتی جاگتی جھلک نظر آتی۔ کار کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر ہاتھ ہلاتے ہوئے...... ٹاٹا پاپا' گڈ بائی کہتا ہوا نومی' جس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن آنسوؤں کی چمک موجود تھی۔ وہ سوچتا...... کاش' وہ بھی ان کے ساتھ چلا گیا ہوتا تب وہ یقیناً اپنی کار لے جاتا اور نومی اس کے ساتھ ہوتا۔ یا تو نومی نہ مرتا' یا پھر وہ بھی اس کے ساتھ مر جاتا۔

ایک دن نشے میں وہ بڑبڑانے لگا...... خود کلامی کرنے لگا ''تم...... تم راندۂ درگاہ ہو عثمان حفیظ۔ بدنصیب انسان۔ تمہاری تو دنیا بھی گئی اور عاقبت بھی۔ خدا نے بیٹے کے روپ میں تمہیں آخری ہدایت دی اور پھر وہ واپس بھی لے لی۔ اب تو تمہارے لیے ہدایت کے دروازے بھی بند ہوئے۔ ڈوب جاؤ...... غرق ہو جاؤ گناہوں میں۔ لعنت ہو تم پر...... غرق ہو جاؤ۔''

ایک تبدیلی اور آئی تھی۔ رات کو وہ نجم انکل کے پاس ضرور جاتا۔ کبھی ثوبیہ بھی اس کے ساتھ ہوتی

اور کبھی شہناز بھی۔ اس رات وہ اکیلا ہی گیا تھا۔

''اچھا ہوا' تم اکیلے آئے؟'' نجم انکل نے کہا ''مجھے تم سے کچھ ضروری اور اہم باتیں کرنا تھیں۔''

''جی انکل' فرمائیے؟''

''دیکھو بیٹے' ایک بات مجھے معلوم ہے۔ میں اب زیادہ عرصے نہیں جی سکوں گا۔''

''ایسی باتیں نہ کریں انکل' پلیز'' عثمان نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ انکل کی صحت بہت تیزی سے تباہ ہو رہی ہے۔

''مجھے معلوم ہے اس لیے کہہ رہا ہوں۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ یہ کچھ کاغذات ہیں۔ ان پر تمہیں دستخط کرنے ہیں'' انہوں نے اس کی طرف کاغذات بڑھائے۔

اس نے بتائی ہوئی جگہوں پر دستخط کر کے کاغذات واپس کر دیئے پھر پوچھا ''یہ کاغذات کیسے ہیں انکل!''

''یہ میری وصیت کے کاغذات ہیں۔ میرے بعد میرا سب کچھ تمہارا ہے...... صرف تمہارا۔''

''یہ تو زیادتی ہے انکل...... شہناز کے ساتھ۔ آپ کو یہ سب کچھ شہناز کے نام کرنا چاہیے۔''

''یہ میں زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہوں۔'' نجم صاحب نے سرد لہجے میں کہا ''عورتیں نادان ہوتی ہیں...... نادان اور کم عقل۔ کاروبار کی انہیں تمیز نہیں ہوتی۔ وہ تو بڑی آسانی سے لٹ جاتی ہیں اور بیٹی ویسے بھی پرائی چیز ہوتی ہے' اپنی نہیں۔ برسوں پہلے میں نے بہت اچھی سرمایہ کاری کی تھی۔ اس پر میں آج تک پچھتایا نہیں'' ان کے ہونٹوں پر بجھی بجھی مسکراہٹ نظر آئی۔ ''میں نے پرائی بیٹی دے کر اپنے لیے ایک اضافی بیٹا حاصل کر لیا تھا۔ اپنے بیٹوں کی بے وفائی کے بعد اب وہی میرے کام آ رہا ہے۔''

عثمان کی آنکھیں بھیگنے لگیں ''میں جانتا ہوں انکل کہ آپ نے مجھ سے ابو جیسی محبت کی ہے لیکن میں اس سب کا مستحق نہیں۔ میں بہت بدل چکا ہوں' بہت گر چکا ہوں انکل۔''

''جانتا ہوں بیٹے۔ تم اور بڑے ہو گئے ہو۔ گر کر اور بلند ہو گئے ہو'' انہوں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا ''میں بہت کچھ...... شاید سب کچھ جانتا ہوں۔ میں تم سے ایک التجا ضرور کروں گا۔''

''آپ حکم کر سکتے ہیں انکل۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم کبھی خوش نہیں رہے پھر بھی میری خواہش ہے کہ ثوبیہ کی شادی ہو تو اس کے ماں باپ یکجا ہوں۔''

''آپ بے فکر رہیں انکل!''

اس رات وہ گھر آیا تو اور بوجھل ہو گیا تھا۔

تین دن بعد اپنے دفتر میں نجم الحسن پر دل کا دورہ پڑا۔ وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ طبی امداد ملنے سے پہلے وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔

☆☆☆☆☆

ار

شہناز پر صدمے اس تواتر سے پڑے کہ اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا۔

نعمان کی موت کا صدمہ اس کیلئے حیرت انگیز تھا۔ وہ تو ہمیشہ اسے ایک بوجھ محسوس ہوا تھا۔ وہ تو ایک چیز تھی' جو زبردستی اس پر تھوپ دی گئی تھی۔ وہ بچہ جسے اس نے کبھی اہمیت اور محبت نہیں دی' جاتے جاتے اسے ان گنت پچھتاوے سونپ گیا تھا جس بچے کو اس نے محرومیوں کے سوا کچھ نہیں دیا' اس نے ہمیشہ کیلئے رخصت ہوتے ہوئے اپنی تمام محرومیوں کو ایک شکایتی جملے میں سمو دیا تھا اور وہ شکایت اس کا دل چیر گئی تھی۔ بے بسی یہ تھی کہ نہ وہ اس کی محرومی کی تلافی کر سکتی تھی' نہ ہی اس کی شکایت کا جواب دے سکتی تھی۔ اس کی ٹوٹتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں جم کر رہ گئی تھی ''مما...... آپ مجھے گود میں کیوں نہیں لیتیں۔'' اور اس وقت وہ اپنی اس عمر کی آواز میں بولا تھا' جب اسے پہلی بار اس محرومی کا احساس...... دکھ ہوا ہو گا۔

اس لمحے اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے بے قصور بچے کو کیسی محرومی دی ہے۔ وہ بچہ اپنی مرضی سے تو اس دنیا میں نہیں آیا تھا اور اپنی وہ صورت بھی اسے اپنی مرضی سے نہیں ملی تھی اب شہناز کو سب کچھ یاد آ رہا تھا جب وہ چلتا پھرتا' جیتا جاگتا بچہ اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا تو اس کی آنکھیں بولتی تھیں...... التجا کرتی تھیں...... مما...... میری مما' مجھے گود میں لے لو۔ اس نے کبھی اس کی آواز نہیں سنی لیکن اس کی آنکھوں میں وہ منظر لہرا گیا کہ وہ ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد کیسے مایوسی سے کندھے لٹکائے اپنے باپ کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس بچے کو کبھی یہ ضد کرنے کی جرات نہیں ہوئی کہ وہ پوٹی ممی سے دھلوائے گا۔ وہ ضد کرتا تھا...... ''میں پوٹی پاپا سے دھلواؤں گا۔''

کیسے کیسے منظر اس کی آنکھوں میں پھرتے تھے۔ وہ نظروں میں چاہت اور محبت لیے کیسے ثوبیہ کے پاس آتا تھا۔ کیسے نفرت سے وہ اسے جھڑک دیتی تھی۔ کیسے وہ ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھتا' کیسی بے بسی ہوتی اس کے معصوم چہرے پر۔ مما...... یہ میری گڑیا بہن ہے' مما' میں اسے پیار کروں گا۔ میں اپنے سارے کھلونے اسے دوں گا۔ مما' میں اسے ماروں گا نہیں۔ مما یہ تو میری گڑیا بہن ہے۔ مما' مجھے اس کے پاس آنے دو اور کیسے وہ اسے جھڑکتی اور دھتکارتی تھی۔ کیسے وہ سر جھکائے' کندھے لٹکائے تھکے تھکے ننھے قدموں سے واپس چلا جاتا تھا پھر شام کو لان میں اپنے پاپا کے سامنے کیسے وہ اپنی گڑیا بہن کو پیار کرتا...... اس کے واری صدقے جاتا۔

کیسے وہ اس کی جھڑکیاں سن کر اسے محبت اور بے چارگی سے تکتا تھا۔ کیسے بہانے بہانے سے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

اس کی ہچکیاں بندھیں تو وہ چونکی۔ ایسا غیر اہم' قابل نفرت بچہ کسی کو اتنا رلا سکتا ہے؟ اب تو یہ رونا' یہ پچھتانا عمر بھر کا ہے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر تو اس کیلئے مامتا بھری تھی۔ نہ جانے چھپی کیسے رہ گئی۔ ارے...... وہ تو اس سے محبت کرتی تھی۔ بدنصیب ماں' وہ محبت کبھی اسے نہ دے سکی۔ اب وہ

ہمیشہ ناسور بن کر اس کے وجود میں رہے گی اور وہ اسے نکال بھی نہیں سکے گی۔ اس کی تو وہ گود ہمیشہ کیلئے اجڑ گئی تھی، جسے اس نے کبھی اسکے وجود سے آباد نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ خلا تو کبھی نہیں بھر سکے گا۔ وہ جسے وہ ہمیشہ رد کرتی رہی، اس کے جگر کا پہلا ٹکڑا تھا۔ وہ اس کے گوشت، اس کے خون سے بنا تھا۔ اس کی ہڈیوں نے رس اس کی ہڈیوں سے حاصل کیا تھا۔ ارے...... یہ کیسا زیاں ہے؟

پھر ممی، سعود اور محمود کی موت کا صدمہ! یہ اتنے صدمے ایک ساتھ کیسے اٹھائے جا سکتے ہیں؟ لگتا ہے، دنیا خالی ہو گئی ہے۔ ہر طرف خلا ہی خلا ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں بچا۔ عثمان ہے، جسے اس نے کبھی قبول نہیں کیا۔ پاپا ہیں، جو اس کی شادی کے بعد پہلے جیسے نہیں رہے۔ وہ تو اسے بے رخی کی سزا دے رہے ہیں، بس ایک ثوبیہ ہی ہے۔

ان دکھوں نے اسے بدل کر رکھ دیا۔ وہ خود بخود بدلتی جا رہی تھی۔ اس نے عثمان کے سلسلے میں بھی اپنا رویہ تبدیل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ چھپی رہنے والی محبتوں سے ڈر گئی تھی، جو اس وقت سامنے آتی ہیں، جب ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کون جانے......

پھر چھ ماہ بعد پاپا بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ ان کی موت کا دکھ کیا کم تھا کہ ان کی موت نے عثمان کو اس کا رقیب بنا دیا۔ یہ شکایت تو اسے پہلے سے تھی کہ پاپا کو ممی اور بھائیوں کی موت کا دکھ اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہیے تھا لیکن انہوں نے نہیں کیا۔ وہ عثمان سے اور قریب ہو گئے شاید اپنی جھوٹی مردم شناسی کا بھرم رکھنے کیلئے پھر وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو اسے ایک اور صدمہ دے گئے۔ انہوں نے وصیت میں اس کیلئے کچھ نہیں چھوڑا۔ سب کچھ عثمان کے نام کر گئے۔ یہ نہیں کہ اسے کوئی خواہش تھی پاپا کی دولت سے۔ غم یہ تھا کہ وصیت میں کہیں اس کا نام تک نہیں آیا۔ جیسے وہ وجود ہی نہیں رکھتی۔ کم از کم وہ بنگلا تو اسے دے جاتے کہ وہ ان کی اور تمام جانے والوں کی نشانی تھی۔

پاپا کی موت کے بعد اس کے بدلنے کا عمل رک سا گیا۔ احساس جرم اور ندامت کو نفرت اور رقابت نے دبا لیا۔ وہ بھی کیا کرتی۔ عثمان کے حوالے سے ہمیشہ اس کے ساتھ زیادتیاں ہوتی آئی تھیں۔

پھر عثمان نے وہ ذلیل حرکت کی کہ احساس جرم وندامت اور ہر محبت مٹ گئی۔ اس کا ہدف اس بار بھی مشکور ہی بنا تھا۔ مشکور نے بتایا کہ اس بار اسے اس کی تین بیٹیوں کے حوالے سے دھمکی دی گئی ہے۔

اس روز وہ اپنے بیڈ روم میں ٹہلتی اور غراتی رہی۔ عثمان حفیظ، میرے پچھتاوے غلط تھے۔ تم ہو ہی اسی قابل۔ تم تو حد درجہ کمینے انسان ہو۔ یاد رکھو، میں تمہیں ایسا سبق دوں گی، ایسا انتقام لوں گی تم سے کہ کبھی نہیں بھولو گے۔

عثمان کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہنے کا تصور بھی اب محال تھا لیکن اسے یہ زہر پینا تھا اور ایک ہی مرتبہ نہیں، قطرہ قطرہ کر کے پینا تھا۔ صرف اور صرف ثوبیہ کی خاطر۔

اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ ثوبیہ کی شادی بہت جلدی کرے گی!

☆☆☆☆☆

اذیت کے دن رینگ رینگ کر گزرتے رہے۔ دنوں کے، اذیتوں کے ڈھیر لگ جاتے تو کہیں ایک سال گزرتا۔ نومی کا خیال، اس کی یاد عثمان کے دل سے کبھی محو نہیں ہوئی۔ وہ ثوبیہ کو ہمیشہ وقت دیتا رہا۔ ایک اسی کی وجہ سے تو وہ زندہ تھا۔

ایک بات اسے عجیب لگتی تھی۔ ثوبیہ کے معاملے میں اس کے اور شہناز کے درمیان مکمل ہم آہنگی تھی۔ اس کیلئے دونوں ایک ہی انداز میں سوچتے تھے۔ اس کی تعلیم و تربیت ایک خاص انداز میں ہو رہی تھی، جو مثالی تھا۔ اسے خود اعتمادی تو دی گئی لیکن ان خرابیوں سے دور رکھا گیا، جو ان کی سوسائٹی میں عام تھی۔

ایک بات پر عثمان ہمیشہ فخر کرتا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ ثوبیہ کو بہت چاہتا تھا لیکن یہ بھی درست تھا کہ شہناز اسے اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ چاہتی ہے بلکہ وہ ثوبیہ سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی لیکن ثوبیہ نے ہمیشہ شہناز کے مقابلے میں اسے زیادہ چاہا تھا۔ بچپن میں بھی اس سے پوچھا جاتا کہ تم کس کی بیٹی ہو تو وہ ہر ترغیب کو نظر انداز کر کے فخر سے کہتی تھی...... ''میں پاپا کی بیٹی ہوں''، اس کی ترجیح جوان ہو کر بھی پاپا ہی رہے۔

درمیان میں بار ہا ایسا ہوا کہ شہناز عثمان کیلئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ اس کے ساتھ رہنا اسے ہر نفس موت کی اذیت معلوم ہونے لگا۔ اس بار ثوبیہ کا خیال بھی اسے ضبط پر مائل نہیں کر سکتا تھا لیکن انجم انکل کی آخری خواہش کی خاطر وہ یہ زہر پیتا اور ہر نفس مرتا رہا۔

چودہ سال گزر گئے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا۔ ثوبیہ نے گریجویشن کر لیا۔ وہ اتنی خوبصورت نکلی تھی کہ اس کی کہیں مثال نہیں تھی۔ صورت شکل میں وہ ماں پر گئی تھی مگر شخصیت کی انفرادی خوبصورتی خالص اس کی اپنی تھی۔ وہ بہت نیک، اطاعت شعار اور خوب سیرت لڑکی تھی۔

عثمان کو اس کی شادی کا خیال ستانے لگا۔

ایک دن شہناز نے اس سے کہا ''مجھے آپ سے ایک ضروری اور اہم بات کرنی ہے۔''

عثمان کو حیرت ہوئی۔ ان کے درمیان گفتگو کم ہی ہوتی تھی۔ ''کہو، کیا بات ہے؟''

''اب ہمیں ثوبیہ کی شادی کر دینی چاہیے۔''

یعنی ہم آہنگی ثوبیہ کے معاملے میں یہاں تک چلی آ رہی ہے۔ عثمان نے حیرت سے سوچا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کوئی رشتہ نظر میں ہے؟''

''رشتے تو اس کے کب سے آ رہے ہیں لیکن آج مسز آفاق نے اسے مانگا ہے۔''

''یہ آفاق صاحب وہی ہیں نا، جن کا اسٹیٹس میں کاروبار ہے؟''

''جی ہاں۔ اشفاق ان کا بیٹا ہے۔ امریکا کی شہریت ہے اس کے پاس۔ وہیں اپنا ذاتی کاروبار بھی ہے۔''

''بہت مناسب ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ اچھی فیملی ہے لیکن یہ بتاؤ' اور کوئی قابل ذکر رشتہ بھی آیا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ عباسی صاحب کے بیٹے کا رشتہ بھی ہے۔''

''اوہ...... یہ تو بہت اچھا ہے۔ بھئی مجھے تو وہ لوگ بہت پسند ہیں'' اس نے کہا ''اور وہ لڑکا تو مجھے بہت ہی پسند ہے۔''

''پسند تو مجھے بھی ہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ ثوبیہ امریکا چلی جائے'' شہناز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

واہ رے ہم آہنگی! اس نے دل میں سوچا۔ وہ تو خود یہ چاہتا تھا کہ ثوبیہ شادی کے بعد ملک سے باہر رہے ''ٹھیک ہے'' اس نے گہری سانس لے کر کہا ''لیکن سب سے اہم بات تو ثوبیہ کی مرضی کی ہے۔ یہ تو معلوم کرو کہ ثوبیہ کسی کو پسند تو نہیں کرتی؟''

''آپ کے نزدیک بھی اس بات کی اہمیت ہے'' شہناز نے طنزیہ لہجے میں کہا ''ویسے یہ میں اس سے پہلے ہی پوچھ چکی ہوں۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔''

''تو پھر اس رشتے کے سلسلے میں بات کرو اس سے۔''

''میں چاہتی ہوں کہ یہ بات آپ کی موجودگی میں ہو۔''

''تو اسے ابھی بلوالو۔''

شہناز نے ثریا سے کہہ کر ثوبیہ کو بلوالیا۔ ثوبیہ کو اس رشتے کے بارے میں بتایا گیا۔ شہناز کے پاس اشفاق کی تصویر بھی تھی۔ وہ بھی ثوبیہ کو دکھادی گئی۔

''پاپا' میرا ایمان ہے کہ میرے معاملے میں آپ لوگ جو بھی فیصلہ کریں گے' اس میں میری بہتری ہوگی'' ثوبیہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا ''لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے امریکا پسند نہیں۔ میں اپنے وطن میں ہی رہنا چاہتی ہوں۔''

''کیا تمہیں خود پر اعتماد نہیں؟ ہم نے تو تمہاری تربیت ایسی کی ہے کہ......''

''یہ بات نہیں پاپا لیکن بلاوجہ خود کو آزمائش میں کیوں ڈالا جائے۔''

''ٹھیک ہے بیٹی ویسے میری خواہش تو یہی تھی کہ...... تمہارے پاپا بھی یہی چاہتے ہیں'' شہناز نے کہا۔

''تو ممی مجھے انکار کب ہے۔ آپ کی اور پاپا کی خوشی میری خوشی ہے' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

اس روز عثمان نے سکون کی سانس لی۔

☆☆☆☆☆

پرزور تالیوں کی مسلسل آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔ مسز شمیم ابھی اسٹیج پر موجود تھیں اور سبھی لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسی وقت احسان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گرم جوشی سے دبایا ''مبارک ہو دوست' دلی مبارک باد۔''

''کس بات کی مبارکباد دے رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کہاں کھوئے ہوئے تھے؟ تم نے سنا ہی نہیں...... عجیب آدمی ہو۔ فکر کیوں کرتے ہو۔ ابھی چند منٹ میں تمہیں بھابی کے ساتھ تنہائی میسر آجائے گی۔''

وہ چڑ گیا ''بتاتے کچھ نہیں ہو اور اپنی ہانکے جا رہے ہو' ہوا کیا ہے؟''

''مسز شمیم نے اپنی انجمن کی طرف سے تمہیں اور بھابی کو اس سال کے مثالی جوڑے کا ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ چلو' ان کا شکریہ تو ادا کرو' وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اسٹیج کی طرف لے چلا۔ شہناز پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

تالیاں تھم گئیں تو احسان نے مائیک تھامتے ہوئے کہا ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ اب عثمان حفیظ مسز شمیم کا شکریہ ادا کریں گے'' اس نے مائیک عثمان کی طرف بڑھایا۔

عثمان نے مائیک ہاتھ میں لے کر ایک نظر شہناز کے مسکراتے چہرے کو اور پھر چہروں کے ہجوم کو دیکھا۔ مسکراہٹ تو سبھی کے چہروں پر تھی لیکن زیادہ تر کی آنکھوں میں حسد بھی نظر آیا۔ کچھ ہونٹ ایسے بھی تھے جن پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی ''خواتین و حضرات! سب سے پہلے تو میں آپ سب کا شکریہ ادا کروں گا کہ آپ نے اس تقریب کو رونق بخشی پھر میں انجمن شادی شدہ خواتین کے حسن ظن پر ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیں اس ایوارڈ کے قابل سمجھا۔ یہ انجمن کے اراکین کی محبت اور نوازش ہے کہ انہوں نے ہمیں نوازنے کا فیصلہ کیا لیکن میں بہت عاجزی' دیانتداری اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ان کے اس فیصلے سے اختلاف کر رہا ہوں......'' اسی پر احتجاجی آوازیں ابھریں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا ''یہ کوئی رسمی انکسار نہیں' سچی بات ہے۔ میں نے اور شہناز نے ایسی ازدواجی زندگی نہیں گزاری کہ مثالی جوڑا کہلائیں۔ یہ بات ہم دونوں سے زیادہ تو کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے میں یہ ایوارڈ قبول کرنے سے مودبانہ انکار کرتے ہوئے یہ التماس کروں گا کہ یہ ایوارڈ ہمارے بجائے کسی مستحق جوڑے کو دیا جائے۔''

دیر تک سناٹا رہا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کچھ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹیں تھیں پھر مسز شمیم نے کہا ''یہ تو آپ کا فیصلہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شہناز اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں۔''

''میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' عثمان نے کہا۔ ''ایوارڈ دونوں کا مشترکہ ہے لہٰذا ایک فریق کا انکار بھی کافی ہے۔ اس سے بہترین جوڑے کے ایوارڈ کی نفی ہو جاتی ہے۔''

''بات معقول ہے'' اختر ہاشمی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس کے باوجود میں شہناز سے جواب سننا چاہوں گی،'' مسز شمیم بولیں۔

شہناز مسکراتی ہوئی اسٹیج پر آئی اور مائیک میں کہا ''خواتین وحضرات! 25 سال میں شاید یہ پہلا موقع ہے کہ میں اور عثمان کسی بات پر متفق ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ میں کیا کہوں۔''

اس شگفتہ جواب اور اس کے مزاحیہ لہجے نے لمحوں میں ماحول کی کشیدگی دور کر دی۔ خوب قہقہے لگے۔

مسز شمیم نے اپنی کھسیاہٹ دور کرنے کیلئے خود بھی شگفتگی کا سہارا لیا ''اگرچہ ان دونوں کا اس موقع پر اتفاق رائے انہیں مثالی جوڑا ثابت کرنے کیلئے کافی ہے تاہم انجمن شادی شدہ خواتین اپنے اعلان کو واپس لیتی ہے۔ ہم سب ان دونوں کی سچائی اور دیانت کو سلام کرتے ہیں۔''

ایک بار پھر لان تالیوں سے گونج اٹھا۔

☆☆☆☆☆

اور اب وہ اکیلے تھے!

تقریب ختم ہو چکی تھی۔ لان کی تمام روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ نوکر سرونٹ کوارٹرز میں جا دبکے تھے لیکن ان دونوں کو ہی روشن کمرا بھی تاریک تاریک سا لگ رہا تھا۔ آدمی بہت زیادہ روشنی میں بہت دیر رہے تو یہی ردعمل ہوتا ہے۔ نارمل روشنی روشنی ہی نہیں لگتی۔ اندھیرا معلوم ہوتی ہے۔ آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی روشنی آنکھوں سے دل تک اندھیرے ہی اندھیرے بکھیر دیتی ہے۔

عثمان اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ اس نے آ کر شراب کی بوتلوں والی کیبنٹ کھولی اور اس میں رکھی ہوئی بوتلوں کو دیکھنے لگا پھر اس نے شوکیس سے جام نکالے۔ پہلا جام اس نے بڑے اہتمام سے توڑا اور ڈسٹ بن کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی ''یس' کم ان''، اس نے کہا۔

دروازہ کھلا اور شہناز کمرے میں آ گئی۔ اس نے بڑی دلچسپی سے اس کے ہاتھ میں موجود ٹوٹے جام کو دیکھا۔ ''ٹوٹ گیا؟'' اس نے پوچھا۔

عثمان نے ٹوٹے ہوئے جام کو ڈسٹ بن میں اچھال دیا ''نہیں، توڑ دیا'' اس نے جواب دیا ''اب ضرورت جو نہیں رہی۔''

''میں بیٹھ سکتی ہوں۔''

''بی مائی گیسٹ'' عثمان نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

شہناز صوفے پر بیٹھ گئی ''بہت خوش نظر آ رہے ہو؟''

''اس کا تو مجھے علم نہیں۔ یہ بتا سکتا ہوں کہ آج میں بہت خوش ہوں۔''

''شاید اس لیے کہ آج اتنے بہت سارے لوگوں کے سامنے میری بے عزتی اور توہین کرنے کا موقع ملا تھا'' شہناز کے لہجے میں کاٹ تھی۔

عثمان نے تمام جام سمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیئے ''تم غلطی پر ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا ''مواقع تو بہت ملے لیکن میں نے ان سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا ویسے یہ تو بتاؤ کہ تم کس توہین اور بے عزتی کا حوالہ دے رہی ہو۔''

''بنومت۔ تم جانتے ہو۔ تم نے وہ ایوارڈ ٹھکرا کے میری توہین کی' مجھے تماشا بنایا' لوگوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع دیا۔''

''بہت خوب۔ یہ تمہارا نکتہ نظر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ایسا کر کے تمہیں مستقل طور پر اور مسلسل تماشا بننے سے بچا لیا ورنہ لوگ ساری عمر تم پر ہنستے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہیں اس پر اعتراض کیوں ہے۔ کیا میں نے غلط کیا؟ کیا ہم مثالی جوڑا ہیں؟''

''اتنے برسوں کی منافقت کے بعد ایک اور منافقت میں کوئی حرج نہیں تھا'' شہناز نے کہا۔ وہ بے حد نرم لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''یہ ایوارڈ اب سے ایک سال پہلے بھی دیا جاتا تو میں شکریے کے ساتھ ہنسی خوشی اسے قبول کر لیتا۔ اس وقت تک میں منافقت پر مجبور تھا مگر آج نہیں ہوں۔ آج ہم مثالی جوڑا کہلاتے تو کل نشان عبرت بن جاتے۔ میں اپنے معاشرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ شادی کے انسٹی ٹیوشن پر لوگوں کا ایمان رہے۔ یہ تباہ نہ ہو ورنہ معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔''

''کیسی ہیرو جیسی باتیں کر رہے ہو۔''

''حالانکہ ولن ہوں' ہے نا؟''

شہناز اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی پھر وہ رک کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی ''سنو عثمان حفیظ' تمہیں شاید معلوم نہیں۔ آج تم حد سے گزر گئے۔ ساری حدیں پھلانگ گئے اور آج میرے صبر کا پیمانہ بھی چھلک گیا۔ میرا ضبط جواب دے گیا ہے۔''

''حد! تمہیں معلوم بھی ہے کہ حد کیا ہوتی ہے؟ صبر...... اس عظیم جذبے کو سمجھتی بھی ہو تم؟ ضبط...... ضبط کا مفہوم بھی معلوم ہے تمہیں؟'' عثمان نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''مجھ سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے' میں نے 25 سال ضبط کیا ہے۔''

''بہت خوب!'' عثمان ہنسنے لگا ''میں چاہتا تو یہ تھا کہ تم ہیروئن ہی رہو اور میں ولن ہی رہوں لیکن تم نہیں چاہتیں تو یہی سہی۔''

''آج یوم احتساب ہے عثمان حفیظ!''

''ٹھیک ہے جان۔ شروع ہو جاؤ۔'' عثمان نے بڑے پیار سے کہا۔ ''بتاؤ کہ میں نے کیا کیا زیادتیاں کیں تمہارے ساتھ۔ کیا کیا ظلم کیے۔ کیسا ضبط کیا ہے تم نے؟ مجھے یقین ہے کہ آج بڑے پیارے لفظوں کے بہت مختلف مفاہیم سامنے آئیں گے۔ آج میں تمہیں کھاؤں گا کہ عمر بھر بھاگتے رہنے

والا چور کوتوالی کو کیسے ڈانٹتا ہے'' یہ کہہ کر وہ گنگنانے لگا ''کل شب احتساب تھی' شب بھر۔ آئینوں میں کھڑے رہے،ہم بھی۔''

شہناز اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی ''پوچھتے ہو کہ میں نے کیا ضبط کیا! جانتے نہیں ہو کیا؟ یاد نہیں ہے کہ کیا کچھ کرتے رہے ہو تم؟ تم نے خود کو شراب میں ڈبو لیا۔ تم مسلسل بدکاری میں مبتلا رہے۔ خود کو آوارہ کال گرلز پر نچھاور کرتے رہے۔ وہ میری توہین نہیں تھی؟ تم شرابی اور عیاش کہلائے۔ تمہارے حوالے سے مجھے طعنے ملے۔ بچوں نے بھی یقیناً یہ اذیت اٹھائی ہوگی۔ انہوں نے اپنے دوستوں' اپنی سہیلیوں سے تمہارے کارنامے ضرور سنے ہوں گے......''

''لیکن وہ پھر بھی مجھ سے محبت کرتے رہے۔''

''بیچ میں مت بولو۔ مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔'' پہلی بار شہناز کے لہجے میں تندی آئی۔

''سوری' تم کہتی رہو۔''

''تم نے خود سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو رسوائی دی۔ میری پاپا تمہاری وجہ سے عمر بھر شرمندہ رہے۔ تم سمجھتے تھے کہ تمہاری عیاشیاں سب سے چھپی ہوئی ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ تم ذلت کی کس گہرائی میں گر چکے ہو لیکن ایسا نہیں تھا عثمان حفیظ۔ سب جانتے تھے' تمہارے دفتر کے تمام ملازم جانتے تھے۔ ان کے ذریعے پورے شہر کو یہ سب کچھ معلوم ہو گیا۔ لوگ مجھ سے ہمدردی کرنے کے بہانے نشتر زنی کرتے رہے۔ یہ سب کچھ سہا میں نے......اور بچوں نے۔ اور تم نے مجھے کیا دیا؟ عزت تک نہیں دی۔ آج ان سب لوگوں کے سامنے مجھے ذلیل کر دیا' جو تمہاری اصلیت سے واقف ہیں۔ جنہیں سب کچھ معلوم ہے۔ یہ عزت دی تم نے مجھے'' وہ اب ہانپ رہی تھی۔

''کہہ چکیں؟ اب مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟'' عثمان نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔

شہناز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''پہلے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔'' عثمان نے کہا۔ ''ایک بات بتاؤ۔ اگر میں نے یہ سب کچھ ایسے کیا ہوتا کہ تمہارے سوا کسی کو پتا نہ چلتا تو کیا تم اسے درست کہتیں؟ اگر تمہیں اور بچوں کو میری بدکاریوں کے طعنے نہ سننے پڑتے تو کیا تمہارا کرب کم ہو جاتا تاش کیا بدکاری چھپانا کوئی کامیابی ہے؟ کیا اس صورت میں بدکاری لائق عذاب نہیں ہوتی؟ اگر یہ درست ہے تو میری اصل غلطی یہ ہوئی کہ میں چھپ کر گناہ نہیں کر سکا۔ گناہ کر کے پردہ نہیں رکھ سکا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہے یا نہیں۔ گناہ تو گناہ ہے۔ بدکاری تو بدکاری ہے۔ بری عورتوں کے پاس جاؤ گے تو کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو' میری توہین و تذلیل تو بہر حال ہوگی۔ مجھے اذیت تو بہر کیف پہنچے گی۔''

''اللہ تمہارا بھلا کرے۔ کیسا درست اور سچا جواب دیا ہے تم نے۔ اب ایک بات اور بتاؤ' تمہیں

اب اس رسوائی میں زیادہ اذیت پہنچی ہے یا اس صورت میں تمہاری اذیت زیادہ ہوتی کہ میرے کرتوتوں کا کسی کو علم نہیں ہوتا؟ کون سی اذیت زیادہ بڑی ہے' سوچ سمجھ کر جواب دو۔''

شہناز کی آنکھوں سے الجھن جھانکنے لگی ''تم تو یوں تبادلہ خیال کر رہے ہو' جیسے یہ کوئی علمی مسئلہ ہے' جسے عقل اور منطق سے حل کیا جانے والا ہو۔''

''بات ایسی ہی ہے۔ اس بات کی بہت اہمیت ہے'' عثمان نے گہری سانس لے کر کہا'' چلو' تمہاری آسانی کیلئے میں اس سلسلے میں ایک تھیوری پیش کرتا ہوں۔ تم صرف اتنا بتا دینا کہ تمہیں اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ لوگوں کو معلوم ہونے کی صورت بہتر ہے۔ وہ تم سے ہمدردی کرتے ہوں گے۔ تمہیں مظلوم سمجھتے ہوں گے اور مظلومیت کا احساس اذیت کو کم کر دیتا ہوگا۔ اب سوچو کہ میری بدکاری کا علم صرف تمہیں ہے' کوئی اور اس بارے میں نہیں جانتا۔ ظاہر ہے' تم کسی کو بتانا بھی نہیں چاہو گی تو وہ عذاب اکیلے ہی سہتی رہو گی۔ تمہارا دل کبھی ہلکا نہیں ہوگا اور وہ بوجھ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دگنا ہوتا جائے گا۔ وہ اذیت زیادہ ہوگی یا نہیں؟''

''میں علمی بحث نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنی اذیت کی بات کر رہی ہوں۔''

''میں بھی اذیت ہی کی بات کر رہا ہوں مجھے جواب چاہیے۔''

''تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ اپنے گناہوں کی تشہیر کر کے تم نے میری اذیت کم کر دی۔ مجھ پر احسان کیا'' شہناز نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''تم نے بالواسطہ تسلیم کر لیا کہ میری تھیوری درست ہے۔ خاموشی سے اکیلے عذاب سہنے کی اذیت کہیں زیادہ ہے۔''

شہناز خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

''لہٰذا ثابت ہو گیا کہ میری اذیت بہت بڑی تھی'' عثمان نے کہا۔

شہناز مسکرائی ''تو تم نے بھی اذیت اٹھائی ہے؟ بہت خوب۔ واقعی......اذیت دینے میں تو بہت زیادہ اذیت ہوتی ہوگی۔''

''میں نے کہا......'' عثمان نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''......میں نے تو وہ اذیت اٹھائی ہے کہ پہاڑ اٹھاتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ سمندر پڑتی تو وہ غیظ و غضب میں پوری زمین نگل جاتا۔ میں نے وہ اذیت بڑی خاموشی سے اٹھائی ہے۔ اندر سے ہر لحظہ ٹوٹتا رہا ہوں میں'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''واقعی؟ ولن تو ہیرو بن رہا ہے۔''

عثمان نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں ''تم کہتی ہو کہ میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں دیا۔ عزت بھی نہیں دی۔ جھوٹ کہتی ہو تم۔ میں نے تمہیں وہ محبت دی' جو تمہیں کہیں اور سے نہ کبھی مل سکی اور نہ مل سکے گی' جس کی تم مستحق بھی نہیں تھیں۔ میں نے تمہیں پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ سب سے قیمتی چیز دی جو کوئی

مرد کسی عورت کو دے سکتا ہے۔ تم کہتی ہو' میں نے تمہیں عزت نہیں دی۔ ارے میں نے تو تمہیں اپنی عزت بنالیا' کوئی مرد کسی عورت پر اس سے بڑا اعتبار نہیں کر سکتا۔ اس سے زیادہ کچھ دے نہیں سکتا اور تم نے کیا کیا؟ میری عزت کو دنیا کے بازار کی سب سے ارزاں چیز بنادیا۔ میں نے تمہیں اپنی عزت بنایا تھا' تم نے خود کو رہگذر کی طرح بچھادیا...... عام رہگذر بنالیا خود کو' جس کو ہرا ایرا غیرا' چور' چمار جب چاہتا روند سکتا تھا۔ کون سا ایسا طبقہ ہے' جس کا کوئی فرد اس رہگذر سے نہیں گزرا۔ باہر کے لوگوں کی بات چھوڑو۔ میرے نوکر' میرے مالی' میرے ڈرائیور تک کو تم نے سیراب کیا۔ پیاسا صرف میں ہی رہا'' اب وہ طوفان کی طرح گرج رہا تھا اور اس نے دیکھا کہ وہ دم بخود سہمی ہوئی بیٹھی ہے۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا ہے'' برسوں پہلے تم نے کال گرلز کی بات کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا...... ان میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ میں نے کہا تھا' ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں' جو تم میں ہیں اور اضافی خوبیاں بھی ہیں مثلاً وہ موڈ کی پابند نہیں ہوتیں۔ انکار نہیں کرتیں' برف کی سل ثابت نہیں ہوتیں اور یہ کہ وہ ضرورتاً خود کو فروخت کرتی ہیں۔ یہ سوال اب پوچھو تو میں کہوں گا...... نہیں شہناز بیگم' وہ بے چاریاں تمہارے سامنے بے حقیقت ہیں۔ وہ تمہارے قدموں کی دھول ہیں۔ انہوں نے اپنا ریٹ مقرر کر کے خود کو ایک معیار تک محدود کر لیا ہے جبکہ تم لامحدود ہو' تمہارا کوئی معیار نہیں۔ وہ بے چاریاں خود کو ضرورتاً فروخت کرتی ہیں جبکہ تم خود کو بلاضرورت فروخت کرتی ہو بلکہ تم خود کو فروخت بھی نہیں کرتیں۔ تمہاری کوئی قیمت ہی نہیں۔ تم تو زمین پر پڑی مٹی ہو' جسے کوئی بھی اٹھالے۔ لوگ مفت میں ملنے والی دولت بھی یوں خرچ نہیں کرتے' جیسے تم خود کو بانٹتی ہو۔ ہر جھولی میں گر جاتی ہو۔ خواہ وہ پھیلی ہوئی بھی نہ ہو۔''

''عثمان' تم حد سے......''

''خاموش رہو۔ آج شب احتساب ہے۔ یہ احتساب کی فرمائش بھی تمہاری ہی تھی۔ اب ساکت کھڑی رہو' آئینوں کے سامنے۔ اپنا چہرہ ہر زاویے سے دیکھ لو'' عثمان دہاڑا'' میں نے تمہیں اپنی عزت بنایا تھا۔ تم میری عزت تھیں۔ تم نے میری عزت کو تار تار کر ڈالا لیکن یہ بھول گئیں کہ تمہارا وجود تار تار ہو رہا ہے۔ تم میرے ذلت کی گہرائیوں میں گرنے کی بات کر رہی تھیں۔ تمہیں کبھی یہ نظر نہیں آیا کہ تم کس پستی تک پہنچ چکی ہو۔ اب بیٹھ کر اپنے خسارے کا حساب کرو۔ تمہارے پاس تو کچھ بھی نہیں بچے گا اور کھاتے میں تمہارے حساب میں اب بھی بے حساب ہوگا۔''

دیر تک خاموشی رہی۔ شہناز گم صم بیٹھی تھی پھر اس نے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ بدلا ہوا تھا۔ نقوش کرخت ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں خوفناک چمک تھی'' تو تمہیں مجھ سے کیا توقع تھی؟ تم سمجھتے تھے...... کہ تمہاری آوارگیوں پر میرا کوئی ردعمل نہیں ہوگا؟''

''ردعمل!'' عثمان نے حقارت سے کہا'' تم کسی بڑی خوش فہمی میں ہو۔ یہ تمہارا ردعمل تھا میری آوارگی پر؟''

''ہاں۔ میں تم سے انتقام لے رہی تھی۔''

''انتقام لے رہی تھیں تو پھر ضبط کا ڈھنڈورا کیوں پیٹتی ہو۔ انتقام اور ضبط ساتھ ساتھ نہیں چلتے'' عثمان نے زہریلے لہجے میں کہا'' اور یہ انتقام بھی خوب ہے۔ تم نے میرا کیا بگاڑا' سوچو تو خود کو ہی تباہ کیا۔ ارے تم تو آئینہ دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہیں۔ میں خراب ہوا تھا تو تم نے خود کو اور زیادہ خراب کر لیا۔ کس بات کا انتقام تھا یہ......؟''

''وہ بھی بتادوں گی'' شہناز کے لہجے میں مضبوطی آگئی'' ورنہ تم یہی سمجھتے رہو گے کہ مجھے تمہاری عیاشی بری لگتی تھی'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی'' مجھے تمہاری عیاشی سے کوئی غرض نہیں تھی' کوئی پروا نہیں تھی مجھے۔''

''میں جانتا ہوں کہ یہ بات نہیں'' عثمان نے اعتماد سے کہا۔'' بنیادی طور پر تمہاری فطرت ہی خراب تھی۔''

''تم مشکور کو جانتے ہو؟'' شہناز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''ہاں...... جانتا ہوں۔''

''اس سے ملے ہو؟''

''دوبار دیکھا ہے اسے۔ ایک بار ملا ہوں۔ دوسری بار ملنا نہیں چاہتا۔''

''تم نے اسے دھمکی دی تھی؟''

''دھمکی تو خالی خولی ہوتی ہے۔ میں نے اسے وارننگ دی تھی۔ عقلمند آدمی ہے' سمجھ گیا۔''

شہناز نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے اعتراف کر لے گا

''کتنی ڈھٹائی ہے تمہارے اندر۔ کیسے سکون سے کہہ رہے ہو کہ اسے وارننگ دی تھی۔ گھٹیا باتوں کا تذکرہ اتنے فخر سے کر رہے ہو؟'' اس کے لہجے میں ملامت تھی۔

''وارننگ نہ دیتا تو کیا صفحی خط لکھتا اسے'' عثمان نے سخت لہجے میں کہا'' اور گھٹیا پن کی بات مت کرو۔ میں نے ایسا گھٹیا پن دیکھا ہے کہ جس سے انسانیت شرمسار ہو کر رہ جائے اور کم از کم تمہارے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔''

''مشکور کی سب سے بڑی بیٹی کی کیا عمر ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی کوئی بیٹی بھی ہے۔''

''جھوٹ مت بولو۔ تم خوب جانتے ہو کہ اس کی تین بیٹیاں ہیں۔''

''مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر وہ تین بیٹیوں کا باپ ہو کر ایسا ہے تو اس کی بے غیرتی میں کوئی کلام نہیں۔''

''اور کسی باپ کو اس کی معصوم بیٹیوں کے حوالے سے بلیک میل کرنے والے کو کیا کہو گے؟'' شہناز

نے تند لہجے میں کہا ''تمہیں اس کی بچیوں کے متعلق ریک دھمکیاں دیتے ہوئے شرم نہیں آئی؟''

''تو موصوف جھوٹ بھی غضب کا بولتے ہیں'' عثمان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''مشکور جھوٹا نہیں۔ وہ مرد ہے' صاف بات کرتا ہے اور منہ پر کرتا ہے'' شہناز کا لہجہ فخریہ تھا۔

''اور پھر بھی اس نے تمہیں اصل بات نہیں بتائی کہ میں نے اسے کیا وارننگ دی تھی؟''

''وہ مجھے بتا چکا ہے۔ تم جھوٹ بول کر اپنے گھٹیا پن پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔''

''جھوٹ سچ تو خیر تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال میں تمہاری...... بلکہ اس کی بات درست مان لیتا ہوں اب مجھے بتاؤ کہ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم مجھ سے اس دھمکی کا انتقام لے رہی تھیں؟''

''ہاں۔ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں اس گھٹیا پن کی بدترین سزا دوں گی' جسے تم کبھی نہیں بھول سکو گے۔''

''چلو مان لیا کہ تم نے مجھے سزا دینے کیلئے خود کو طوائف بنا ڈالا...... بلکہ اس سے بھی بدتر۔ زمین پر پڑی ہوئی کھوٹی چونی' جسے ہر راہ گیر اٹھا کر دیکھتا تھا اور چند لمحے بعد دوبارہ وہیں پھینک دیتا تھا۔ جیب میں رکھنے کی زحمت کوئی بھی نہیں کرتا تھا'' وہ غور سے شہناز کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہر لفظ پر وہ یوں سمٹ رہی تھی' جیسے وہ کوڑا بن کر لگ رہا ہو۔ ''مگر اب یہ بتاؤ کہ بہت پہلے...... اٹھارہ برس...... بلکہ شاید اس سے بھی پہلے سے جو گھناؤنا کھیل تم مشکور کے ساتھ کھیل رہی تھیں' اس کا کیا جواز تھا؟ اس وقت تو میں نے مے نوشی بھی نہیں شروع کی تھی۔ میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی دوسری عورت بھی نہیں تھی۔ بولو...... جواب دو مجھے اس بات کا؟''

شہناز اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''تت...... تت...... تو...... کک...... تو کیا......؟'' اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''ہاں۔ مجھے اٹھارہ برس سے معلوم ہے یہ بات'' عثمان نے نفرت بھرے لہجے میں کہا ''تم ابھی کچھ دیر پہلے حد کی بات کر رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ میں حد سے گزر چکا ہوں۔ ساری حدیں پھلانگ چکا ہوں۔ تم حد کیا جانو۔ حد تو تم پر عائد کی جا سکتی تھی۔ ساری حدیں تو تم پھلانگ گئی تھیں۔ تم صبر و ضبط کی بات کر رہی تھیں ابھی۔ صبر اور ضبط تم کیا سمجھو گی۔ میں نے صبر کیا ہے...... میں نے 18 برس ضبط کیا ہے۔ میں زہر تھوکنے کے بجائے اپنے اندر اتارتا رہا ہوں۔ سمجھیں زہریلی ناگن۔''

''لیکن کیسے؟''

''موسم...... ہاں' وہ موسم تھا' جس نے تمہارے گناہ کو بے نقاب کیا تھا......''

☆☆☆☆☆

عثمان حفیظ اس رات کو کبھی نہ بھول سکا۔ بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی تمام جزئیات اس کے دماغ پر نقش ہو گئی تھیں۔

اندر کا حال بھی ابتر ہی تھا۔ وہ ان دنوں شہناز کے مزاج کے سرد و گرم کا سب سے سخت موسم جھیل رہا تھا۔ ایک دن اچانک ہی وہ اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہا تھا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ مہربانی طول پکڑے گی' مگر ہوا ایسا ہی۔

شہناز کی مہربانی کا وہ موسم ایک سال سے زیادہ عرصے پر محیط تھا اور وہ بہت خوش تھا۔ زندگی خوبصورت ہو گئی تھی۔ گھر جنت بن گیا تھا۔ شہناز کے ہونٹوں پر خیر مقدمی مسکراہٹ کے گلاب ہوتے۔ اس کی آنکھوں میں بلاوے ہوتے اور انداز میں محبت۔ وہ سوچتا کہ شاید یہ حقیقت نہیں' محض ایک خوبصورت خواب ہے لیکن خواب میں ایسا کیف کہاں ہوتا ہے؟

ہر زمین کا اپنا ایک موسم ہوتا ہے۔ شہناز کو اس نے پانچ سال دیکھا تھا۔ اس کے موسم روز بدلتے تھے...... پل پل بدلتے تھے۔ اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کا کوئی موسم دیرپا بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے وہ حیران تھا اور اس حیرانی نے اس کے انبساط کو دوچند کر دیا تھا۔

وہ بہار سے پہلے آنے والی بارش کا موسم تھا۔ وہ بارش جو بہار کی نقیب ہوتی ہے جس کا ایک قطرہ سوکھے درختوں کو نمو سونپتا ہے۔ جس کی وجہ سے شاخوں کے مساموں سے کلیاں سر اٹھاتی ہیں۔ شرماتی ہوئی ہری ہری کونپلیں پھوٹتی ہیں' شگوفے کھلتے ہیں۔

ہاں' وہ بہار سے پہلے کی بارش تھی۔ وہ برس رہی تھی اور وہ بھیگ رہا تھا۔ اس بھیگنے میں' شرابور ہونے میں ایسی سرشاری تھی' جس سے وہ واقف ہی نہیں تھا۔

ایسی لذت تھی کہ وہ ساکت ہو جاتا تھا لیکن اس کے اندر رقص کا سماں جاگ اٹھتا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے وجود میں پورا گلستان بن گیا ہے۔ رنگا رنگ اور مہک سے لدے ہوئے پھول جھوم رہے ہیں۔ بارش اور کچھ دیر ہو گئی تو وہ باہر سے بھی کھل اٹھے گا۔

لیکن اس پر بہار نہیں آئی۔ بارش وقت سے پہلے رک گئی۔ موسم تبدیل ہو گیا۔ آسمان چلچلاتی دھوپ سے بھر گیا۔ چلچلاتی دھوپ...... اور وہ بھی بارش کے بعد کی دھوپ جس کی ہر سانس نیزے کی تیز دھار والی انی ہوتی ہے۔ آخری نمو کی محتاج کلیاں سہم گئیں۔ اس دھوپ میں کملانے لگیں' مرجھا گئیں۔ کونپلوں کی سانسیں تھمنے لگیں۔ شگوفوں کے دم گھٹ گئے۔ آتی ہوئی بہار کے بجائے خزاں کے آنے کا تجربہ بالکل نیا تھا۔

اس کے اندر رقص کا سماں تو اب بھی تھا لیکن اب وہ رقص وحشت تھا۔

جیسے ایک سال پہلے شہناز مثبت طور پر بدلی تھی' اب منفی طور پر بدل گئی۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا لیکن نہیں' پہلے جیسا کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ درست کہ وہ وہی بے رخی اور سرد مہری جھیل رہا تھا' جو اس نے

شادی کے پہلے پانچ برس میں جھیلی تھی۔ وہ اسی برفانی دیوار سے اپنا وجود ٹکرا رہا تھا' جو اس کیلئے نئی نہیں تھی لیکن فرق تھا...... بہت بڑا فرق تھا اب وہ اس دیوار کے اندر کی حدت پی چکا تھا۔ جانتا تھا کہ وہاں لاوا بھی ہے لیکن اس لاوے کو جگانے والا منتر اسے معلوم نہیں تھا۔ وہی اذیت' جو وہ پہلے بھی اٹھاتا رہا تھا اور زندہ رہا تھا' اب اسے لذت کے' کیف و انبساط کے بعد ملی تھی تو لگتا تھا کہ وہ نہیں سہہ سکے گا۔ یہ اذیت اب اسے مار ڈالے گی۔ ختم کر دے گی۔ تیز بارش میں بھیگنے والے جسم پر اچانک تیز دھوپ پڑے تو وہ تو ٹوٹے گا ہی۔ ڈیڑھ سال پہلے وہ ایک لڑکا تھا' جو لذتوں سے بے خبر تھا۔ جسے کچھ معلوم نہیں تھا مگر پچھلے ایک سال نے اسے مکمل مرد بنا دیا تھا جس پر زندگی کے تمام راز کھل چکے ہوں۔ اب وہ اذیت کا ہر مفہوم سمجھ سکتا تھا۔

وہ سوچتا کہ یہ سب کیوں ہوا...... کیسے ہوا۔ وہ تو اپنی جگہ قانع ہو چکا تھا۔ اس نے محرومی سے سمجھوتا کر لیا تھا پھر شہناز میں وہ تبدیلی کیوں آئی اور اب وہ پھر پہلے جیسی کیوں ہو گئی۔ جو اذیت وہ اٹھا رہا ہے' وہ شہناز کو بھی تو ہوتی ہو گی۔

لیکن اسے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔

تو یہ وہ حالات تھے' یہ اس کی کیفیت تھی کہ وہ رات آ پہنچی اسے ایک اجازت نامے کے سلسلے میں اسلام آباد جانا تھا۔ نائٹ کوچ میں اس کی سیٹ ریزرو تھی۔ فلائٹ ساڑھے دس بجے کی تھی۔

وہ شام کو گھر جانے کیلئے دفتر سے نکلا تو موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ ڈرائیو کرنے میں اسے بہت لطف آیا لیکن یہ وہ دن تھے جب اسے بارش سے نفرت ہو گئی تھی۔ اندر محرومی کا موسم چل رہا ہو تو باہر کا خواہش جگانے والا موسم کسے اچھا لگتا ہے۔ اس روز موسم نے اسے اور بھڑکا دیا تھا۔ اپنی خودداری اور عزت نفس کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس نے شہناز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ معمول کے مطابق اس کا ہاتھ جھٹک دیا گیا۔ اپنے مزاج کے خلاف اس نے التجائیں کیں۔ اس نے خوشامد کی لیکن شہناز ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

''آپ سمجھتے کیوں نہیں'' شہناز نے تنک کر کہا تھا ''یہ جسم اور روح' دل اور دماغ کے امتزاج کا مسئلہ ہے۔ یہ کوئی بجلی نہیں کہ سوئچ دبایا' روشنی کر دی۔ سوئچ دبایا۔ اندھیرا کر دیا۔ یہ گیس کا چولہا نہیں کہ ناب گھمائی' دیا سلائی دکھائی اور چولہا جل گیا۔''

''مگر میں کیا کروں؟'' اس نے بے بسی سے کہا ''تم نے مجھے ایسا آن کیا ہے کہ میں خود کو آف کر ہی نہیں پا رہا ہوں۔''

''میرے آن کرنے سے آن ہو گئے تو آف کرنے سے آف کیوں نہیں ہوتے۔''

''مجھے نہیں پتا'' وہ جھنجھلا گیا ''تم خود سوچو۔ کتنا عرصہ ہو گیا۔ ایک نارمل آدمی کیلئے یہ بہت ہوتا ہے۔''

''مگر میں کیا کروں۔ میری آمادگی کا بھی تو کوئی سوئچ نہیں۔''

''بس آج تم میری خاطر...... پلیز......'' وہ گڑگڑانے لگا۔

''یہ تو ممکن نہیں عثمان۔ ہاں' میں یہ کر سکتی ہوں کہ پہلی فرصت میں کسی ماہر نفسیات سے رجوع کروں۔''

''پلیز شہناز......''

''سوری عثمان۔ چھوڑو...... یہ بتاؤ' کھانا کھاؤ گے۔''

''نہیں۔ بھوک نہیں ہے۔''

''آج بارش ہو رہی ہے کچھ پکوان تیار کراؤں؟''

''نہیں۔ مجھے خواہش نہیں ہے۔''

''حالانکہ برسات میں پکوڑوں کیلئے پاگل ہو جاتے ہو۔''

''پاگل تو اب بھی ہو رہا ہوں لیکن تمہارے لیے۔''

''واپس کب آؤ گے؟'' شہناز نے پوچھا۔

''کل تک آنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے امکان یہی ہے کہ واپسی پرسوں ہی ہو گی۔''

وہ ایئرپورٹ جانے کیلئے گھر سے نکلا تو بوندا باندی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ڈرائیور اسے ایئرپورٹ چھوڑ کر گھر واپس چلا گیا۔ اس نے بورڈنگ ٹکٹ لیا اور لاؤنج میں چلا گیا۔

جہاز نے ٹھیک ساڑھے دس بجے ٹیک آف کیا۔ وہ بے حد ہموار پرواز تھی لیکن اس کے نصیب میں اسلام آباد لینڈنگ نہیں تھی۔ وہ اسلام آباد پہنچے تو وہاں موسم اتنا خراب ہو چکا تھا کہ جہاز کا لینڈ کرنا ناممکن تھا۔ متبادل ایئرپورٹس کو بھی ٹرائی کیا گیا لیکن بات نہیں بنی۔ آخری فیصلہ یہی ہوا کہ فلائٹ کراچی واپس جائے گی۔

جہاز خیریت سے کراچی پہنچ گیا۔ بوندا باندی اب بھی جاری تھی۔ ٹرمنل سے باہر آ کر اس نے ٹیکسی کی اور گھر کی طرف چل دیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ تین بج کر دس منٹ ہوئے تھے اچانک اسے احساس ہوا کہ بارش تیز ہو گئی ہے۔ اس نے کھڑکی کے شیشے چڑھا دیئے۔

بارش مسلسل زور پکڑ رہی تھی۔ بارش کی ٹپاٹپ اسے اپنے دل پر بجتی محسوس ہوئی۔ وجود میں پھر شوریدہ سر خواہشوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی دل میں امید بھی جاگ اٹھی۔ شہناز تنہائی بھی محسوس کر رہی ہو گی۔ کون جانے' یہ موسم اس پر بھی اثر انداز ہوا ہو۔ وہ سوچ رہی ہو کہ کاش اس وقت وہ اس کے پاس ہوتا۔ کون جانے' اس کے وجود میں بھی اس وقت خواہشیں اسی طرح شور مچا رہی ہوں اور ایسے میں وہ اچانک پہنچے تو...... وہ عجیب سی سرشاری محسوس کرنے لگا۔

''اب کدھر چلنا ہے صاحب؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے اسے چونکا دیا۔

وہ ٹیکسی ڈرائیور کو گائیڈ کرنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ ''بس یہاں روک دو۔''

ٹیکسی والے کو پیسے دے کر اس نے پہلے جیب سے گھر کی چابیاں نکالیں' جو ہمیشہ اس کے پاس رہتی تھیں پھر وہ اپنا بریف کیس لیے نیچے اترا۔ چوکیدار یقیناً اپنی کوٹھڑی میں سو رہا ہوگا۔ وہ سوائے شہناز کے کسی کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے چابی لگا کر گیٹ کھولا اور صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ بری طرح بھیگ گیا اور اسے سردی لگنے لگی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر گیا۔ ماسٹر بیڈروم کی طرف بڑھتے بڑھتے وہ رک گیا۔ اسے خیال آیا کہ سب سے پہلے اسے ان بھیگے کپڑوں سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ وہ اس کمرے میں چلا گیا' جسے اس نے نومی کی پیدائش کے بعد اپنی خواب گاہ بنایا تھا۔

شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے وہ باہر آیا۔ ماسٹر بیڈروم کے دروازے کا ہینڈل گھمانے پر اندازہ ہوا کہ دروازہ مقفل ہے۔ اس کی چابی بھی اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ دروازے پر دستک دے اسے جگائے یا اپنے کمرے میں جا کر سو جائے۔ عام حالات میں اسے کبھی کسی سوئے ہوئے کو ڈسٹرب کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ جذبات سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ وہ اس وقت رک نہیں سکتا تھا۔

اس نے دروازے پر دستک دینے کیلئے ہاتھ اٹھایا لیکن ہاتھ درمیان میں رہ گیا۔ اندر سے اسے واضح طور پر ایک مردانہ آواز سنائی دی تھی۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ دروازہ لاک ہے۔ صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ شہناز کے کمرے میں کوئی مرد کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ یقیناً اس کی سماعت کا وہم ہے۔ اس نے پھر ہاتھ اٹھایا۔ اس بار وہ عین دستک دیتے وقت ٹھٹک گیا۔ آواز پھر سنائی دی تھی۔

وہ بہت مہذب انسان تھا۔ چھپ کر باتیں سننا' کسی کی خواب گاہ میں جھانکنا' کسی کی پرائیویسی ڈسٹرب کرنا اس کے مزاج میں نہیں تھا لیکن وہ بے حد مختلف صورتحال تھی۔ وہ خواب گاہ اس کی بیوی کی تھی' جو اس کی محرم تھی۔ وقت رات کے آخری پہر کا تھا اور اندر سے کسی مرد کی آواز آ رہی تھی۔

وہ جھکا اور اس نے کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ اندر پوری طرح روشنی ہو رہی تھی۔ اس کی محبت کا تاج محل جگمگا رہا تھا مگر تاج محل کے پس منظر میں اسے جو کچھ نظر آیا اس نے اس کے وجود میں آگ بھڑکا دی۔ اس کا جی چاہا' اپنی آنکھیں پھوڑ لے۔

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کا جسم بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔ دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

جو اس نے دیکھا تھا' حقیقت ہے؟ یا وہ فریب نظر ہے۔ یہ دیکھنے کیلئے اسے پھر جھکنا تھا...... پھر کی ہول سے جھانکنا تھا لیکن اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی اگر وہ حقیقت نکلا تو کیا ہوگا۔ نہیں...... وہ فریب نظر ہے...... محض تمہارا وہم۔ ذہن کے ایک حصے نے کہا۔ سوچو تو ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟

وہ ہمت کر کے پھر جھکا اور کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے اس نے آنکھ ہٹا دی۔ سینکڑوں چیخیں اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ وہ منظر وہم نہیں' حقیقت تھا۔ جگمگاتے تاج محل کے سامنے وہ دونوں کھڑے تھے اور وہ جس حال میں تھے' کاش انہیں دیکھنے سے پہلے اسے موت آ جاتی۔

مرد اس کیلئے اجنبی تھا۔ اس نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا لیکن اجنبی تو وہ عورت بھی تھی۔ وہ اس کی بیوی' اس کی شہناز تو نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر اس نے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی ایسی چمک تو اسے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی لیکن نہیں۔ وہ شہناز ہی تھی...... اصل شہناز' جو اسے کبھی نہیں ملی تھی۔ اسے تو شاید ڈمی ملی تھی شہناز کی۔

اس کا ردعمل وہی تھا' جو ایسی صورتحال میں کسی مرد کا ہو سکتا ہے۔ جو ازل سے ہوتا آیا ہے۔ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ دماغ پر چڑھ دوڑا تھا۔ وہ اس وقت دروازہ توڑ دیتا اور اپنے ہاتھوں سے...... صرف اپنے ہاتھوں سے ان دونوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا۔ انہیں ختم کر دیتا۔ اس وقت اس کی پوری اہلیت تھی اس میں بلکہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ اس وقت کچھ بھی کر سکتا تھا۔

لیکن کوئی طاقتور...... بے حد طاقتور جبلت اس کی رہنمائی کر رہی تھی ورنہ اس وقت وہ سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اتنا کچھ دیکھنے کے بعد عقل کہاں ساتھ دیتی ہے۔

اندر سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس بار اس نے جھک کر کی ہول سے کان لگا دیا۔ زہر اس کی سماعت میں اترنے لگا۔

''تمہارا جسم تاج محل سے زیادہ حسین ہے جان'' ہوس میں ڈوبی ہوئی مردانہ آواز...... توقف......

''تمہارا بہت خوش نصیب ہے۔''

''اگر اس سے پوچھو تو وہ یہ نہیں کہہ سکے گا'' وہ بھرائی ہوئی آواز شہناز کی نہیں لگ رہی تھی۔ لہجے میں تضحیک تھی۔

''کیا مطلب؟ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ بدذوق ہے۔''

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ بدنصیب ہے۔''

''وضاحت کرو۔''

''اس نے مجھے کبھی ایسے نہیں دیکھا۔''

''اوہ...... بے چارہ۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ اس کے دیئے ہوئے اس تاج محل کی روشنی میں اس سے زیادہ حسین عمارت دیکھ رہا ہوں۔''

''یہ تو ہے'' اٹھلاتی ہوئی نسوانی آواز......

''ویسے آدمی خوش ذوق ہے۔ یہ تاج محل گواہی دے رہا ہے۔''

''گھٹیا آدمی اور اعلیٰ ذوق ہے۔ عجیب کامبی نیشن ہے۔''

''تم نے تو پھر سے بھوک جگا دی۔ چلو......'' ملی جلی حیوانی آوازیں۔

عثمان نے جھٹکے سے کان ہٹا لیا۔ اسے حیرت تھی کہ اسے کچھ ہو کیوں نہیں رہا۔ وہ پاگل کیوں نہیں ہو جاتا...... دھماکے سے پھٹ کیوں نہیں جاتا۔ اس کے اندر وحشتیں ناچ رہی تھیں۔ وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ دروازے کو ٹکریں مار کر توڑ دینے کی خواہش بے حد شدید تھی مگر اسی طاقتور جبلت نے ایک بار پھر اسے روک دیا۔ جکڑ لیا لیکن اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

اس کے قدم بے ساختہ اٹھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے تو خود کو بس اپنے کمرے میں دبایا۔ دروازہ اس نے بہت آہستگی سے لاک کر دیا تھا۔ سوچے سمجھے بغیر...... غیر ارادی طور پر۔ کمرے کی لائٹ آن تھی۔ اس نے اسے بھی آف کر دیا۔

اندر کی وحشت رک نہیں رہی تھی بلکہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس وقت وہ پوری کائنات کو کھلونے کی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ سکتا تھا لیکن جبلی طور پر اسے احساس تھا کہ اس وقت اسے خود کو باندھ کر رکھنا ہے۔ پہلے اسے عقل کی روشنی میں سوچنا سمجھنا اور کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کچھ بھی کرنا خطرناک ثابت ہوگا۔

بند کمرے میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھا اور اس نے کھڑکی کھول دی۔ بارش اور سرد ہوا نے احساس دلایا کہ اب وہ کم از کم سانس لے سکتا ہے۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ اندر کی آگ سرد تو نہیں ہوئی البتہ کچھ قابل برداشت ضرور ہوگئی۔

بارش کا رخ کھڑکی ہی کی طرف تھا۔ ذرا دیر میں ہی وہ پوری طرح بھیگ گیا لیکن خاصی دیر تک اسے احساس نہیں ہوا پھر اچانک ہی اسے تھرتھری چڑھ گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بارش تھم گئی تھی اور سرد ہوا کی کاٹ بڑھ گئی تھی۔ جسم کو سردی لگی تو اندر کی تکلیف تو نہیں' تکلیف کا احساس ضرور کم ہو گیا۔ نہ ہوا ہوتا تو اسے پھر کپڑے بدلنے کا خیال نہ آتا۔ اس نے کپڑے بدل لیے اور پھر کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ہوا اب بھی سرد لگ رہی تھی...... ڈسٹرب کر رہی تھی لیکن اس وقت ڈسٹرب کرنے والی کوئی ایسی چیز اس کی ضرورت تھی۔ اسی طرح وہ کچھ سوچنے کے قابل ہو سکتا تھا۔ وہ ایسی صورتحال تھی جس میں سکون آدمی کو بے سکونی میں مبتلا کرتا ہے۔

اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ فوراً ہی اس کے تصور میں وہ منظر لہرایا اور وہ پاگل ہونے لگا۔ دھیان ہٹانے کیلئے اس نے ادھر ادھر کی باتیں سوچنے کی کوشش کی۔ اسے بچوں کا خیال آیا۔ ہاں۔ بچے تو سب سے اہم ہیں۔ ہر چیز سے...... ہر بات سے زیادہ اہم۔ بچوں کا خیال بے حد خوش آئند تھا جیسے اوپر سے گرنے والے کو کوئی مضبوط گرفت مل جائے۔

سوچنا تو پڑے گا۔ اس نے اپنے ذہن کو تیار کرنے کی کوشش کی۔ حقائق سے تو منہ نہیں موڑا جا سکتا پھر وہ دنیا میں کوئی پہلا مرد تو نہیں' جس کے ساتھ یہ ہوا ہے اور وہ آخری بھی نہیں ہوگا۔ یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ اخباروں میں تقریباً ہر روز ایسی کوئی خبر شائع ہوتی ہے۔

وہ پھر بھڑک گیا۔ اخباروں کی سرخیاں اس کی نظروں میں پھر گئیں۔ خبروں میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ غرایا۔ ساتھ ہی ایسی بیوی کی اور دوسرے شخص کے قتل کی خبر بھی تو ہوتی ہے اور میں بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔ وہ کون سی قوت تھی' جس نے مجھے روک دیا۔ مجھے نہیں رکنا چاہیے۔ میں بھی وہی کروں گا۔

سرد ہوا جسم کو تھپکیاں دے رہی تھی اور وہ شانہ ذہن پر دلیل کی تھپکیاں دے رہا تھا لیکن بپھرا ہوا شیر قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بعد کی خبریں اخبار میں نہیں چھپتیں۔ اس نے جھنجلا کر خود سے کہا۔ چھپتی ہیں۔ بہت بعد میں تو یہ حوالہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی واقعے کا تسلسل ہے۔ ورنہ سوچو۔ آدمی نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ خود پھانسی پر چڑھ گیا۔ اور بچوں کا کیا بنا۔ یہ جیب کترے' قاتل' جرائم پیشہ نوجوان اور طوائفیں۔ یہ سب کہاں سے آتے ہیں ایسے ہی تو ہوتے ہیں' جن کے سر پر ماں باپ کا سائبان نہیں ہوتا۔

اس خیال نے اسے ہلا دیا۔ اس کے بچے بے سائباں ہوں۔ معاشرے میں بے نشاں ہوں۔ نہیں۔

تو پھر میں کیا کروں؟ دماغ کے اندر کوئی چلایا۔ طلاق دے دو اسے؟

بات وہی ہے۔ اس نے سوچا۔ طلاق دوں گا تو وجہ کیا بتاؤں گا؟ اصل بات بتاؤں گا تو میری اور بچوں کی بے توقیری ہوگی۔ ہم معاشرے میں طنز و تضحیک کا نشانہ بنیں گے۔ میرا تو خیر کچھ نہیں لیکن بچے تباہ ہو جائیں گے۔ یہ وجہ نہ بتاؤں تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگا۔ میری پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ بچے مجھ سے نفرت کریں گے اور اپنی غلیظ ماں کو اچھا سمجھیں گے۔ کون جانے' اس کے ساتھ رہنا بھی پسند نہ کریں۔ ماں کے ساتھ رہیں۔ یہ بھی خسارہ ہوگا بچوں کا۔

تو اس سے باز پرس کروں؟ سختی کروں اس پر؟ یہ تو اللہ کا حکم ہے۔ دماغ چیخا۔

لیکن اب عثمان کے پاس بہت روشنی تھی۔ مکمل آگہی تھی۔ تمام معمے حل ہو گئے تھے۔ شہناز کی شخصیت' اس کی ہر بات' ہر عمل کا بھید اس پر کھل چکا تھا۔ وہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی کے روکے رکنے والی نہیں تھی۔ سختی کی جاتی تو جو کچھ چھپ کر ہو رہا تھا' کھلے عام ہونے لگتا۔ اس کے بعد طلاق کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ یہ طے تھا کہ شہناز کو عزت کی کوئی پروا نہیں۔ وہ تو عزت کو اپنے پیروں تلے روندنے کی قائل ہے۔

تو کیا یہ سب ہونے دوں؟ پھر ایک چیخ ابھری۔

ہاں۔ ہونے دو۔ اپنے بچوں کی بہتری' ان کے مستقبل کی خاطر یہ زہر پیتے رہو۔ وہ بھی چلایا اور کچھ نہیں کر سکتے تم۔ آنکھیں بند کر لوں؟

بے غیرت بن کر زندہ رہوں؟

بیٹی کے باپ ہو۔ یہ بے غیرتی برداشت نہیں کرو گے تو اس سے بڑی بے غیرتی نصیب میں آئے گی۔ چپ ہو جاؤ۔

عثمان کی سمجھ میں سب کچھ آ رہا تھا۔ شہناز روز اول سے اس سے نفرت کرتی رہی تھی وجہ وہ نہیں سمجھ سکتا تھا وہ دانستہ اسے دھتکارتی رہی تھی۔ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس نے اسے پیاسا رکھا تھا پھر جب اسے احساس ہوا کہ اس نے پیاس سے سمجھوتہ کرلیا ہے تو اس نے انداز بدل کر وار کیا۔ اسے اپنا عادی بنایا اور اس کے بعد پھر دھتکارا تا کہ وہ آئندہ کبھی سمجھوتا نہ کر پائے۔

وہ پہلے دن سے اس کے ساتھ کھیل کھیلتی رہی تھی۔ وہ اسے تباہ کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے کوئی کسر بھی نہیں اٹھا رکھی تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ تباہ ہو چکا تھا اور اب جو تباہی ہونا تھی' اس کا تو اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

صدر دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ عثمان نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا پانچ بجے تھے۔ سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا تھا لیکن آسمان پر اب بھی گھٹا تھی جس کی وجہ سے کافی اندھیرا تھا پھر بھی عثمان کو ان کی دیدہ دلیری پر حیرت تھی۔

شہناز نے گیٹ کھول کر اپنے مہمان کو گرم جوشی سے رخصت کیا۔ وہ پلٹی تو عثمان کھڑکی کے سامنے سے ہٹ چکا تھا۔ عثمان کو صدر دروازہ بند ہونے کی' ہر راہداری میں شہناز کے قدموں کی آواز سنائی دی پھر ماسٹر بیڈ روم کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔

اتنی دیر میں عثمان فیصلہ کر چکا تھا۔ چوکیدار یا کسی اور ملازم کے بیدار ہونے سے پہلے اسے رخصت ہو جانا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ تیار ہو کر بنگلے سے نکل گیا۔ خاصی دور تک پیدل چلنے کے بعد اسے ٹیکسی ملی۔ وہ انٹر کانٹی نینٹل چلا گیا۔ اسی رات نائٹ کوچ سے وہ اسلام آباد چلا گیا۔ کام نمٹانے میں اسے دیر نہیں لگی۔ اگلے دن وہ گھر واپس آ گیا۔

اس بار شہناز کو روبرو دیکھنا ایک مختلف تجربہ تھا۔ وہ اس کی نفرت سی پھنک رہا تھا۔ چلو' خواہشوں کے عذاب سے تو نجات ملی۔ اس نے سوچا۔

''اتنے غور سے دیکھ رہے ہیں؟'' شہناز نے پوچھا۔

''دیکھ رہا ہوں کہ تم اتنی خوبصورت بھی نہیں ہو' اس نے جواب دیا ''لیکن میں نے تمہیں دیکھا بھی کہاں ہے؟''

''کیا مطلب؟'' شہناز بری طرح چونکی۔

''میں اس طرح سے تمہیں کہاں دیکھ سکا ہوں' جیسے دیکھنا میرا حق ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

''دکھانا پسند کرو گی؟'' اس نے شہناز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ حجاب بھی کوئی چیز ہوتی ہے'' شہناز کے لہجے میں ترشی تھی۔

''واقعی؟ خیر اب مجھے ضرورت بھی نہیں۔ میں تمہیں دیکھ چکا ہوں۔ یہ بتاؤ' تم ماہر نفسیات سے ملیں۔''

''نہیں۔''

''حیرت ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم میرے جاتے ہی اس سے ملی ہو گی'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا ''اب تو ملنے کی ضرورت بھی نہیں۔''

''کیوں؟ کیا ہو گیا؟''

''میں نے سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ جیسا ہے......'' اس نے شہناز کے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''...... یہ تو مجھے کہیں بھی مل سکتا ہے۔ بعض اوقات مشکل مسائل کا سامنے کا حل بھی آدمی کو نظر نہیں آتا'' یہ کہہ کر وہ پلٹا اور شہناز کو جواب دینے کا موقع دیئے بغیر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

چند روز میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ فیصلہ کرنا آسان ہے لیکن اس پر عمل بہت مشکل ہوتا ہے۔ جو عذاب اس نے سہنے کا فیصلہ کیا تھا' وہ بہت بڑا' بہت خوفناک تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دفتر میں کام کر رہا ہوتا تو کی ہول سے نظر آنے والا وہ خوفناک نظارہ اسے ستاتا۔ اس کی تو رات کی نیند بھی حرام ہو گئی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی نظروں میں اس کی کوئی عزت نہیں رہی تھی۔ اتنا کچھ ہو گیا اور اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ مرد تو بہت بااختیار ہوتے ہیں۔ وہ سوچتا۔ میں کیسا مرد ہوں۔ اسے خود پر شک ہونے لگتا۔

وہ شک اسے گناہ کی راہ پر لے گیا۔ عورتوں کے ساتھ اس کا انداز بے حد متشددانہ ہوتا۔ لگتا تھا کہ اسے ساری دنیا کی عورتوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ عورت نے اسے پامال کیا ہے۔ وہ ساری دنیا کی عورتوں سے بدلہ لے رہا تھا۔

مگر بے غیرتی کا احساس سوہان روح بن کر رہ گیا۔ وہ کبھی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ اس نے خود کو شراب میں غرق کر لیا کہ اس طرح خود فراموشی تو ملے گی لیکن نشے میں ہوتا تو وہ منظر اسے اور ستاتا۔ وہ تو آسیب کی طرح اس کی یادداشت سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ کبھی ایک رات بھی سکون سے نہیں سو سکا۔ ہر رات وہ وہی سب کچھ خواب میں بھی دیکھتا تھا۔ اس کی ہر مختصر نیند اسی خواب پر ختم ہوتی تھی...... بعض اوقات ایک رات میں کئی کئی بار!

اس کا نومی دنیا سے چلا گیا۔ ایک بیڑی کٹ گئی مگر دوسری تھی اور وہ زیادہ مضبوط بھی تھی۔ وہ بیٹی جو تھی۔ بیٹی کیلئے عزت اور آبرو سے رخصت ہونے کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو کوئی محرومی نہیں دینا چاہتا تھا۔

پھر ثوبیہ کی شادی ہو گئی۔ اسے رخصت کے بعد وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اب وہ آزاد تھا۔ باضابطہ طور پر بھی آزاد ہو سکتا تھا لیکن اس نے سوچا' جہاں اتنا صبر کیا ہے' کچھ دن اور سہی۔ وہ اپنی آزادی کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔ ازدواجی عذاب کی سلور جوبلی بھی ہو جائے اور نئے سال سے نئی زندگی کا آغاز ہو۔ اس کیلئے اسے یکم جنوری کا انتظار تھا۔

☆☆☆☆☆

’’تم ضبط کی بات کرتی ہو‘ عثمان نے حقارت سے کہا ’’مجھے سکون کی نیند سوئے اٹھارہ برس ہو گئے۔‘‘

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شہناز کا چہرہ بدلنے لگا۔ خدوخال کی خوبصورت یکسر ختم ہو گئی۔ اب وہ چڑیل سی نظر آ رہی تھی۔ ’’مجھے خوشی ہے کہ میری قربانی رائیگاں نہیں گئی‘‘ وہ بولی۔

’’تمہیں مجھ سے بہت نفرت تھی؟‘‘

’’ہاں‘ اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔‘‘

’’مجھے تمہاری شخصیت سے نفرت تھی۔ تم کمزور تھے‘ بزدل تھے۔ تم مرد نہیں تھے۔ مردانگی نہیں تھی تم میں۔ تم خود سوچو۔ تم نے کبھی مردانگی کا ثبوت دیا؟‘‘

عثمان اس کے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کر دیا۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا ’’میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں‘‘ اس نے کہا ’’پھر بھی میں تمہاری زبان سے مردانگی کی تعریف سننا چاہتا ہوں۔‘‘

’’مرد طاقتور ہوتا ہے۔‘‘ شہناز نے کہا ’’اس کے ارادے اور عزائم بلند ہوتے ہیں۔ وہ دنیا میں جو چاہتا ہے‘ حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ کوئی کام چھپ کر نہیں کرتا۔ اس میں بزدلی نہیں ہوتی۔ وہ عورتوں کی طرح چھپ کر وار نہیں کرتا۔‘‘ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ’’میں نے تمہیں ذلیل کیا‘ دھتکارا۔ تم میرے سامنے گڑگڑائے۔ میں پھر بھی نہ مانی تو تم ہار کر بیٹھ گئے۔ مرد ایسے ہوتے ہیں۔‘‘

’’ہاں۔ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں‘‘ عثمان نے چیخ کر کہا اور شہناز کی کلائی پوری طاقت سے پکڑ لی ’’تم یہ کلائی چھڑا سکتی ہو؟ چھڑا کر دکھاؤ۔‘‘

شہناز نے کلائی چھڑانے کیلئے زور لگایا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ گرفت بہت سخت تھی۔

’’نہیں چھڑا سکتیں۔ اسی طاقت کی بات کر رہی تھی نا تم‘‘ عثمان نے حقارت سے کہا ’’یہ طاقت تو قدرتی طور پر ہے مجھ میں۔ لیکن طاقت کا اظہار مردانگی نہیں۔ میں اسے چھچھوراپن سمجھتا ہوں۔ طاقتور کی ذمے داری ہے کمزور کو تحفظ فراہم کرنا۔ نہ کہ اسے دبانا اگر میں صبح وشام تمہاری مرمت کرتا تو تمہاری نظر میں مرد ٹھہرتا لیکن اپنی نظروں میں گر جاتا‘‘ اس نے شہناز کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اسے سہلانے لگی ’’اور میرے ارادے اور عزائم بلند تھے۔ میں بہت اچھا انسان بننا چاہتا تھا۔ میں اپنے بچوں کی بہت اچھی پرورش کرنا چاہتا تھا۔ انہیں حتی الامکان دکھ اور تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر کیا لیکن ایک کمزور شخص نے میری راہ کھوٹی کر دی۔ مجھے شکست دے دی لیکن نہیں مجھے میرے طاقتور ہونے کے احساس نے شکست دے دی۔

’’تم کہتی ہو‘ مرد دنیا میں جو چاہتا ہے‘ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ بھی مردانگی نہیں۔ جنگ اور محبت میں

سب کچھ جائز ہے۔ میرے نزدیک یہ مقولہ بھی نامردوں کا بنایا ہوا ہے۔ یہ تو خود کمزوری کا اظہار کر رہا ہے۔ مرد کیلئے بااصول ہونا ضروری ہے۔ جائز بات پر ڈٹ جائے اور ناجائز بات سے ہٹ جائے۔ خواہشیں تو بے شمار ہوتی ہیں دنیا میں۔ عورت کمزوری اسی لیے ہے کہ آسانی سے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ طاقت اللہ اس لیے نہیں دیتا کہ انسان اپنی مرضی کے سامنے کسی کا احترام نہ کرے۔ مرضی تو صرف اللہ کی چلتی ہے۔ اس کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا اور میں نے کوئی کام چھپ کر کیا تو صرف بچوں کی وجہ سے ورنہ جہاں آدمی خدا سے نہ ڈرے تو کسی بندے سے کیا ڈرے گا۔

’’اور سنو۔ یہ درست ہے کہ تم نے مجھے ذلیل کیا‘ دھتکارا۔ میں تمہارے سامنے گڑگڑایا۔ تم نہ مانیں تو میں نے خواہش کو اپنے سر پر سوار کرنے کے بجائے اسے تسخیر کر لیا۔ میرے نزدیک یہی مردانگی تھی۔ تم اسے ہارنا کہتی ہو۔ وہ تو بہت بڑی فتح تھی۔ تمہارے خیال میں یہ مردانگی ہوتی کہ میں من مانی کرتا۔ زبردستی کرتا۔ طاقت کے زور پر تمہیں زیر کر لیتا۔ اسے ریپ کرنا کہتے ہیں۔ تم سمجھتی ہو‘ ریپ کرنا مردانگی ہے۔ اس مردانگی کا ثبوت تو میں آب بھی دے سکتا ہوں‘‘ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

’’اب تم بے غیرتی کو بھی قربانی قرار دو گے‘‘ شہناز نے مضحکہ اڑایا ’’تم سب کچھ جانتے تھے پھر بھی تم نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ الگ بات کہ میں رکتی نہیں۔ تم نے مجھے سزا بھی نہیں دی۔‘‘

’’میں تمہیں اور تمہارے اس عاشق کو اپنے ان ہاتھوں سے ختم کر سکتا تھا...... نمونہ دیکھ لو‘‘ اس نے پوری قوت سے شہناز کے منہ پر تھپڑ مارا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ چند منٹ وہ کوشش کے باوجود نہیں اٹھ سکی۔ اس نے گرے گرے منہ سے خون تھوکا۔ ایک دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ کئی دانت ہل گئے تھے۔

’’درندے...... وحشی......‘‘ وہ بولی۔

’’درندہ‘ وحشی نہیں‘ مرد کہو...... مرد!‘‘ عثمان نے زہریلے لہجے میں کہا ’’یہی تو مردانگی ہے تمہارے نزدیک۔ ورنہ میں تو عورت پر ہاتھ اٹھانے کو بزدلی سمجھتا ہوں۔ کہو تو اس وقت بزور تمہیں حاصل کر کے دکھاؤں۔‘‘

’’نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔‘‘

’’غلط! کر سکتا ہوں لیکن کروں گا نہیں۔ یہ جسم جسے تم ان گنت انسان نما کتوں کے آگے پھینک چکی ہو‘ میرے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا۔ وہ کہتے کہتے رکا ’’تو میری خوبیوں اور اپنی جہالت کی بنا پر تم مجھ سے نفرت کرتی رہیں؟‘‘

’’نہیں۔ اصل بات تم جانتے ہو۔ تم نے مجھ سے میری محبت چھینی تھی۔‘‘

’’تو یہ مردوں والا کام ہوا نا۔ مرد دنیا میں جو چاہیں‘ حاصل کر لیتے ہیں‘‘ عثمان نے اس کا مضحکہ اڑایا

پھر وہ سنجیدہ ہوگیا ''یہ الگ بات کہ یہ مردانگی مجھ سے سرزد نہیں ہوئی۔ یہ میرے مزاج میں ہی نہیں ویسے یہ حوالہ مشکور ہی کا ہے نا؟ تم اس سے محبت کرتی تھیں؟''

شہناز اٹھی اور صوفے پر بیٹھ گئی ''بنومت...... تم یہ بات جانتے تھے۔''

''اس کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ پہلے ایک بات پوچھ لوں تم سے۔ تمہارے خیال میں مشکور میں تمام مردانہ خصائل ہیں۔ وہ ایک مکمل مرد ہے؟''

''ہاں۔ اس لیے میں تمام عمر اپنی محبت اس پر نچھاور کرتی رہی۔......''

''اپنی محبت بھی اور آبرو بھی۔ اور میری عزت بھی؟''

''ہاں'' شہناز نے کہا ''وہ ایک مکمل مرد ہے۔''

''اب ذرا یہ بھی بتادو کہ میں نے تمہاری محبت کیسے چھینی؟''

''سب جانتے ہیں تم'' شہناز نے غصے سے کہا ''تم میری محبت جیت بھی سکتے تھے لیکن تم نے اس کیلئے ناجائز طریقے اختیار کیے۔ تم کہتے ہو کہ تم جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز کے مقولے کو درست نہیں سمجھتے۔ یہ بتاؤ کہ بلیک میلنگ مردانہ وصف ہے؟ تم نے میری محبت چھیننے میں بزدلی دکھائی۔ عورتوں کی طرح چھپ کر وار کیا۔ تمہیں سزا کوئی عورت ہی دے سکتی تھی۔ میں نے تمہیں بدترین سزا دی۔ مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں......''

''ایک منٹ'' عثمان نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دعویٰ تھوڑی دیر بعد کرنا تو بہتر رہے گا۔ جلد بازی مت کرو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ میں نے کیا جرم کیا تھا؟ کیسے چھینی تھی تمہاری محبت؟''

شہناز کی نظروں میں ریسٹورنٹ کا وہ 25 برس پرانا منظر پھر گیا۔ اس کی سماعت میں مشکور کی وہ گفتگو گونجی؛ جب اس نے بتایا تھا کہ وہ اس سے شادی نہیں کرسکتا۔

اس نے وہ گفتگو دہرادی۔ اس کے ہر ہر لفظ پر عثمان کا رنگ بدلتا گیا ''اب بولو تم'' شہناز نے چیلنج کیا ''آئینے میں دیکھو کہ تم کیا ہو۔''

''دیکھ رہا ہوں۔ تم بھی دیکھتی رہو جب نظر آئے گا تو گزری ہوئی پوری زندگی پچھتاوا بن جائے گی'' عثمان نے کہا ابھی تو اپنے پسندیدہ مکمل مرد کا اصل چہرہ دیکھو۔ یہیں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں ایک منٹ میں۔''

وہ کمرے میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو کاغذ تھے۔ اس نے ایک کاغذ شہناز کی طرف بڑھا دیا ''یہ لو۔ یہ ہے تمہارے مکمل مرد کا بیع نامہ۔ اس سے تمہیں پتا چلے گا کہ اس نے کس طرح خود کو فروخت کیا۔ کیسے خود کو غلامی میں دیا۔ پڑھو اسے'' اس کا لہجہ تحکمانہ ہوگیا۔

شہناز نے اس پر دستاویز کو پڑھا۔ اس کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔

''تم وہ تاریخ تو کبھی نہیں بھول سکتیں جب مشکور نے تمہیں میری بزدلی اور بلیک میلنگ کی کہانی سنائی تھی۔''

''کیسے بھول سکتی ہوں۔ مجھے یاد ہے۔ وہ 27 ستمبر تھی۔''

''اور اس پر تاریخ دیکھو۔ 26 ستمبر۔ یہ معاہدہ اس سے ایک دن پہلے ہوا تھا۔''

''میں کیسے یقین کرلوں کہ یہ دستاویز جعلی نہیں ہے'' شہناز نے کمزور لہجے میں ہا۔

''یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے ویسے میں کل اسے ادائیگی کا نوٹس بھجواؤں گا تو سب پتا چل جائے گا۔''

''میں نہیں مان سکتی'' شہناز کا انداز خود کلامی کا سا تھا ''لیکن تم بتاؤ تو۔ تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔''

''میں کچھ ثابت کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو تمہیں اس کا اصل چہرہ دکھا رہا ہوں۔''

''اس سے کیا ثابت ہے؟''

''تمہارے آئیڈیل مرد کی مردانگی'' عثمان نے کہا ''یہ نہ بتاؤ کہ تم کچھ سمجھی ہی نہیں ہو۔ جو حقیقت ہے اس کا سامنا کرو۔''

''میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔''

''میں حاضر ہوں۔'' عثمان نے تمسخرانہ لہجے میں کہا ''پہلے تو اس دستاویز کو سمجھ لو۔ اس کے مطابق تمہارے پاپا نے 26 ستمبر کو مشکور علی کو بیس لاکھ روپے قرض دیئے تھے اب 25 سال ہوچکے ہیں۔ طے شدہ شرح سود کے مطابق اب اسے کم از کم پچاس لاکھ ادا کرنے ہیں۔ اب وہ خود کو فروخت بھی کرے گا تو اتنی رقم اکٹھی نہیں کرسکے گا اب سوچو کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ بس یہ کہ اب وہ اپنے انجام کو پہنچے گا۔''

''لیکن اس نے اس رقم سے کاروبار شروع کیا تھا تو تھوڑا تھوڑا کر کے قرض چکایا کیوں نہیں؟'' شہناز نے اعتراض کیا۔

''بھولی بننے کی کوشش مت کرو۔ تم سب سمجھ چکی ہو'' عثمان نے ترشی سے کہا ''ادا کرنے کا تو جب خیال آتا کہ یہ قرض ہوتا۔ مشکور مطمئن تھا کہ اسے رقم واپس نہیں کرنی۔ اس لیے کہ یہ قرض نہیں' یہ تو اس نے اپنی محبت کی قیمت وصول کی تھی۔ ذرا سوچو تو...... کتنی مہنگی تھی تمہاری محبت بیس لاکھ روپے میں بکی۔ اب اسی سودے کی غیر تحریری شرائط بھی سن لو۔ اسی بیس لاکھ کے بدلے مشکور نے وعدہ کیا تھا کہ وہ خود تم سے شادی سے انکار کردے گا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی تمہاری زندگی میں مداخلت نہیں کرے گا۔''

وہ کہتے کہتے رکا۔ اس نے گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام جوڑا ''خالص فلمی اور افسانوی سچویشن ہے نا۔ فلم یا افسانے میں ہیرو ایسی بڑی سے بڑی پیشکش ٹھکرا دیتے ہیں۔ ولن قبول کر لیتے ہیں لیکن تحریر کبھی نہیں دیتے۔ اس سے اندازہ لگاؤ کہ تمہارا ہیرو کتنا لالچی تھا۔ نجم انکل نے اس سے اس کی قیمت پوچھی۔ اس نے بتادی۔ انکل نے قبول کرلی لیکن یہ شرط عائد کردی کہ اسے قرض کی تحریر دینی پڑے گی تاکہ خلاف ورزی کی صورت میں اسے سزا دی جاسکے۔ اس نے اس شرط کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ انکل

مرحوم ڈٹ گئے۔ انہوں نے کہہ دیا کہ اس کے بغیر وہ اسے ایک دھیلا نہیں دیں گے۔ بے شک وہ تم سے شادی کر لے۔ اس صورت میں بھی اسے کچھ نہیں ملے گا۔ وہ تمہیں عاق کر دیں گے اگر مشکور اسٹینڈ لے لیتا تو شاید انکل کو ہار ماننا پڑتی لیکن تمہارا ہیرو تو بیس لاکھ کی ترغیب سے ہار چکا تھا۔''

''اور تمہیں یہ سب معلوم ہے'' شہناز نے نفرت سے کہا ''یہ آئیڈیا بھی تمہارا ہی ہوگا۔ تم نے یوں میری محبت خریدی......''

''مجھے تو مشکور کے متعلق معلوم تک نہیں تھا۔ میں نے تو پہلی بار اس رات تمہاری خواب گاہ میں اسے دیکھا تھا۔ یہ خط ہے۔ یہ بھی پڑھ لو'' اس نے شہناز کی طرف دوسرا کاغذ بڑھایا ''انکل احساس جرم کا شکار تھے۔ اسی لیے انہوں نے کبھی مجھے میری آوارگی اور بے راہ روی پر نہیں روکا۔ شکر ہے کہ انہیں تمہاری گراوٹ کا علم نہیں تھا ورنہ وہ جیتے جی مر جاتے اور پھر مشکور سے قرض کی رقم واپس مانگتے کیونکہ اس نے اپنے وعدے کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ شکر ہے کہ انہیں معلوم نہیں ہوا۔''

''پھر بھی پاپا ہمیشہ مجھ سے خفا رہے'' شہناز کے لہجے میں گرفتگی تھی۔

''اب تمہارا اپنا ہیرو کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ تو مثالی مرد تھا نا'' عثمان نے طنزیہ لہجے میں کہا ''بیس لاکھ کے عوض وہ تمہاری محبت سے دستبردار ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اسے تم سے نہیں' تمہاری دولت سے محبت تھی۔ دوسری بات' وہ لالچی ثابت ہوا پھر وہ کم حوصلہ بھی تھا کہ تمہیں سچ نہیں بتا سکا۔ اس نے جھوٹ بولا۔ یہ بھی مردوں کا شیوہ نہیں۔ اس نے تمہیں تحفظ نہیں دیا بلکہ بے وقوف بنایا۔ اس نے مجھ پر چھپ کر وار کیا اور وہ بھی اوچھا پھر اس نے عہد شکنی کی۔ اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ وہ تمہیں پامال کرتا رہا۔ اس نے تمہیں استعمال کیا اور میری عزت اور میرا گھر بھی تباہ کر دیا۔ ایسے ہی ہوتے ہیں مثالی مرد؟ اب دیکھو آئینے میں اپنی زندگی......اور باقی عمر نفرت کرو......خود سے بھی اور اس سے بھی۔''

شہناز کا چہرہ نفرت نے مسخ کر دیا تھا ''وہ ولن تھا تو ہیرو تم بھی نہیں تھے۔ تم بے غیرتوں کی طرح مجھے لٹتا دیکھتے رہے۔ تمہیں مجھ کو روکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔''

''اپنی بے غیرتی مجھے تسلیم لیکن میں نے بیٹی کی خاطر وہ زہر پیا۔ اس کی شادی ہوگئی تو میں آزاد ہوا مگر بعد کی بھی تو سن لو۔ انکل کی موت کے بعد مجھے ان کا خط اور قرض کی دستاویز ملی۔ میں نے مشکور کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور تنبیہہ کی کہ اگر اب کبھی وہ تم سے ملا تو اسے تباہ کر دوں گا۔ کاش...... میں تمہیں وہ منظر دکھا سکتا۔ وہ کیسے گڑگڑایا۔ اس نے میرے پاؤں تک پکڑ لیے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا اور وہ پورا بھی کیا لیکن تمہیں اس نے پھر ایک جھوٹی کہانی سنا دی۔ میں اسے اس کی بیٹیوں کے حوالے سے بلیک میل کروں گا! ارے' میں تو اسے ختم بھی کرا سکتا ہوں۔ خود بھی ختم کر سکتا تھا اسے۔ اس نے گھٹیا پن کی حد کر دی۔''

''اپنی بیٹی کی محبت میں تم نے خود کو بے غیرت بنا لیا۔ یہی کہہ رہے ہو نا تم؟''

''ہاں۔ ورنہ اس رات میں خود تمہیں اور اس کو قتل کر دیتا لیکن دانشمندی' دور اندیشی اور برداشت بھی مردانہ اوصاف ہی ہیں۔''

''بے چارے تم'' شہناز نے عجیب سے لہجے میں کہا ''واقعی تم بہت مظلوم ہو۔''

''پرائی چیز کی خاطر اتنے کشٹ جھیلے تم نے۔ کیسا زہر ہلاہل پیتے رہے۔ افسوس......''

''بیٹیاں تو ہوتی ہی پرایا دھن ہیں۔ میرے لیے نہیں' سبھی کیلئے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے کوڑھ مغز انسان'' شہناز نے نفرت سے کہا ''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ثوبیہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔''

عثمان پر یہ الفاظ بم کی طرح گرے۔ اس کے ذہن پر شہناز کے الفاظ کی معنویت پوری طرح اجاگر نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی کچھ کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''وہ تمہاری نہیں' مشکور کی بیٹی ہے۔''

'یہ...... یہ نہیں ہو سکتا'' عثمان نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

''یہ بات مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔''

''نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ویسے یاد کرو۔ مجھے اب بھی افسوس ہوتا ہے کہ میں نے نعمان کو کتنی تکلیف پہنچائی۔ کتنی نفرت کی اس معصوم سے۔ صرف اس لیے کہ وہ تمہارا بیٹا تھا۔ تمہاری تصویر تھا وہ لیکن ثوبیہ کو میں نے کتنا چاہا۔ پوری ممتا نچھاور کی اس پر اس لیے کہ وہ میری اور مشکور کی بیٹی تھی۔ تمہاری اولاد سے تو میں محبت کر ہی نہیں سکتی تھی۔

لمحوں میں عثمان کی نظروں کے سامنے سے برسوں گزر گئے۔ اس نے جان لیا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ اس کے اندر نفرت کا ایک طوفان اٹھا۔ وہ طوفان یقیناً اسے بہا لے جاتا۔ وہ اس طوفان کے سامنے بے بس تھا لیکن اسی لمحے اندر سے سمندر جیسی محبت امنڈی اور اس طوفان کو پی گئی۔ وہ محبت ثوبیہ کی تھی۔ وہ اس محبت کو ٹٹولتا رہا۔ اس محبت میں اسے کوئی کھوٹ نہیں ملی۔ اس انکشاف سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا کہ وہ اس کی بیٹی نہیں ہے۔

اس محبت نے تھپک تھپک کر اسے پرسکون کر دیا۔ اس نے سوچا' سارے عذاب تو میں اٹھ چکا ہوں۔ اب کیا غم کرنا اب تو عمر کی شام ہوگئی ہے اور مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو بیٹی سے بیٹی جیسی محبت ہی کروں گا۔

''یہاں تم ہار گئیں شہناز بیگم'' اس کے لہجے میں سمندر کی سی خاموشی اور گمبھیرتا تھی ''ثوبیہ کیلئے میری محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مجھے کوئی محرومی نہیں ملی۔''

شہناز نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ آنکھوں میں چیلنج۔

وہ پھنک کر رہ گئی۔ چیلنج تو وہ ہمیشہ کرتی رہی تھی اسے۔ آج وہ اسے چیلنج کر رہا تھا۔ یہ تو اس کی توہین تھی

''ایک اہم بات اور بتانی ہے مجھے'' اس نے کہا۔

''ضرور بتاؤ۔ اس لیے کہ پھر کبھی موقع نہیں ملے گا۔''

''میں نے شوہر کی حیثیت سے تمہیں کبھی قبول نہیں کیا۔ اسی لیے میں سہاگ رات کو سہاگ کے جوڑے میں تمہارے سامنے نہیں آئی۔ میں نے تم سے وعدہ کیا کہ شادی کی پہلی سالگرہ پر وہ جوڑا پہنوں گی۔ دوبارہ دلہن بنوں گی۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا لیکن تمہارے لیے نہیں۔ میں اس روز مشکور کی دلہن بنی تھی۔ وہ پہلا دن تھا تم سے میری بے وفائی کا۔ اس روز دلہن بن کر میں نے خود کو مشکور کی جھولی میں ڈال دیا تھا اور پھر اسی روپ میں تمہارا استقبال کیا تھا۔

عثمان کو اندازہ تھا کہ وہ کوئی زہریلا انکشاف کرے گی۔ اس نے خود کو اس کیلئے تیار کر لیا تھا۔ وہ تیاری کام آ گئی۔ اس نے بے پروائی سے کہا ''میں اتنا کچھ سہہ چکا ہوں کہ اب کسی بات سے مجھے تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ ہاں، یہ بات سنانے کے بعد تم اپنے بارے میں غور کرو۔ اردو لغات لے کر اپنے لیے کوئی مناسب لفظ تلاش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں ایسا کوئی لفظ نہیں ملے گا اور ہاں، بیٹھ کر دنیا بھر کی کتابوں میں مرد کی تعریف تلاش کرو اب تمہارے پاس فرصت ہی فرصت ہوگی۔ اپنے ماضی کو گزارتی رہو اور پچھتاوے کماتی رہو کہ گناہ پچھتاووں کے سوا کچھ نہیں دیتے۔''

''تم مجھے مارو گے نہیں؟''

''جب مارنا تھا، تب نہیں مارا۔ اب کیا فائدہ۔ اب تو ہر سانس تمہارے لیے موت ہوگی۔ میں نے تمہیں وہ محبت دی، جس کا کوئی بدل نہیں تھا اور تم اس کی مستحق نہیں تھی۔ یہ میرا دکھ ہے، جسے میں جھیل چکا ہوں اب عذاب اٹھانے کی تمہاری باری ہے۔ اس بار میں تمہیں دو تحفے دوں گا۔ ایک پوری سچائی سے، دل کی گہرائیوں سے تمہارے لیے درازی عمر کی دعا اور دوسرے، طلاق۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔''

شہناز اب ساکت بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ ست گیا تھا۔

''میں جا رہا ہوں شہناز بیگم۔ یہ گھر تمہیں مبارک ہو۔ میں یہاں سے کچھ لے کر نہیں جاؤں گا...... سوائے آزادی کے، جو آج مجھے مل گئی ہے۔ میں اس گھر میں جا کر رہوں گا، جہاں کبھی تم رہتی تھیں، وہ شہناز جو بہت اچھی تھی جہاں انکل نجم اور آنٹی رہتی تھیں جہاں سعود اور محمود رہتے تھے۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی پاپا۔''

دروازے کی سمت سے آنے والی آواز نے ان دونوں کو ہلا دیا۔ انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ دروازے میں ثوبیہ کھڑی تھی۔ اس کے قدموں میں ایک

بیگ رکھا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں لیکن چہرے پر عجیب سی سختی تھی۔

''بیٹی تم...... اندر آ جاؤ نا'' عثمان نے اسے پکارا۔

''نہیں پاپا۔ اب یہ چوکھٹ پار کر کے میں اندر نہیں آ سکتی۔ آپ ہی کو باہر آنا ہوگا۔''

''تم یہاں کیسے......؟'' شہناز نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''وہیں رک جائیں خاتون'' ثوبیہ نے سرد لہجے میں تنبیہہ کی۔ ''میں نہیں چاہتی کہ آپ میرے وجود کو اور گندہ کریں۔''

''ثوبیہ، تم......''

''میرا نام نہ لیں آپ'' ثوبیہ نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ ''آپ کی زبان میرا نام بھی گندہ کر دے گی۔''

''تم کب سے کھڑی ہو یہاں؟''

''بہت دیر ہو گئی۔ میں نے آپ کا بیان سن لیا کہ میں کس کی بیٹی ہوں۔''

شہناز گنگ ہو کر رہ گئی۔ عثمان کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ''بیٹی تم تو امریکا میں تھیں۔ تم یہاں کیسے آ گئیں؟ خیریت تو ہے؟''

''یہ سب کچھ میں یہاں...... اس اجنبی اور بدخواہ عورت کے سامنے نہیں بتا سکتی۔'' ثوبیہ نے شہناز کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری ماں ہوں، کیسی بھی سہی۔ تمہیں چاہا ہے میں نے'' شہناز نے کہا۔

''میں نہیں مانتی۔ میری مما بھی یہی ہیں اور پاپا بھی۔'' ثوبیہ نے عثمان کی طرف اشارہ کیا ''آپ تو میرے لیے ذلت کا نشان ہیں۔'' وہ عثمان سے مخاطب ہوگئی ''پاپا آ بھی جائیں، میں آپ سے لپٹنے کو بے تاب ہوں۔''

عثمان نے محبت سے اسے دیکھا۔ اس کا بدن لرز رہا تھا۔ لگتا تھا، وہ کسی بھی لمحے ڈھے جائے گی۔ وہ اس کی طرف لپکا اور اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ پوری جان سے لرز رہی تھی اور اس کے رخساروں کو بار بار چوم رہی تھی ''پاپا...... آپ میرے پاپا ہیں نا...... آپ میری مما ہیں نا...... میرے پاپا...... میرے پیارے پاپا......''

''ہاں میری گڑیا۔ میں ہی سب کچھ ہوں تمہارا اور تم...... تم تو میری جان ہو۔ میرا سرمایہ زندگی ہو تم'' عثمان نے اسے سینے سے بھینچ لیا ''آؤ چلیں......''

وہ اسے لپٹائے ہوئے راہ داری میں قدم بڑھانے والا تھا کہ عقب سے شہناز نے التجائیہ لہجے میں اسے پکارا ''عثمان...... میری ایک بات سنو۔''

عثمان رک گیا لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

''اتنا کچھ تم نے مجھے دیا۔ تو ایک چیز میرے کہنے پر بھی دے دو۔''

''بولو۔''

''اس مشکور کو نہ بخشنا'' شہناز کے لہجے میں نفرت تھی۔ ''اسے کیفرکردار تک پہنچانا۔ اس سے پورا قرض مع سود وصول کرنا.....''

''اس کیلئے کسی سفارش کی ضرورت نہیں۔ یہ تو مجھ پر انکل کا قرض ہے اور قرض میں ضرور چکاتا ہوں' عثمان نے کہا اور ثوبیہ کو لئے آگے بڑھ گیا۔

''اپنے شوہر کا گھر چھوڑ آئی ہوں۔''

''لیکن کیوں بیٹا؟''

''وہ وہاں جو زندگی گزار رہے ہیں' میرے لیے ناقابل قبول ہے۔ میں نے انہیں کہہ دیا کہ وہ مجھے بیوی کی حیثیت سے رکھنا چاہیں تو پاکستان آ جائیں۔ میں ایک سال ان کا انتظار کروں گی ورنہ.....''

''ٹھیک کیا بیٹا۔ مجھے فخر ہے کہ میری تربیت کام آئی۔ تم نے پوری خود اعتمادی سے درست فیصلہ کیا۔''

''پاپا..... آپ تفصیل سنے بغیر اسے درست فیصلہ کہہ رہے ہیں۔''

''تفصیل میں گھر چل کر سن لوں گا ویسے مجھے یقین اور اعتماد ہے کہ تمہارا فیصلہ درست ہوگا اب مجھے ڈرائیونگ پر توجہ دینے دو۔ او کے؟''

''او کے پاپا!''

☆☆☆☆☆

وہ کسی گہرے اندھے کنوئیں میں قید تھی!

رات گزری' صبح ہوئی' وہ اسی خوابگاہ میں بیٹھی تھی' جس سے اس نے منفی حربوں سے عثمان کو بے دخل کیا تھا۔ ملازمہ اسے ناشتے کیلئے کہنے آئی تو اس نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''تم جاؤ۔ میں ناشتا کر لوں گی۔ چلی جاؤ۔''

''بیگم صاحبہ' دوپہر کے کھانے پر کیا پکاؤں؟''

''جو جی چاہے' پکا لو۔ دن میں بھی اور رات کو بھی۔ مگر خبردار مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو میں خود طلب کر لوں گی۔''

اس کے پاس ایک ہی کام تھا۔ وہ ماضی کے ایک ایک لمحے کو ٹٹولتی رہی۔ یہ عمل ایسا تھا' جیسے کوئی برسوں سے زمین پر پڑے پتھروں کو الٹ کر دیکھے تو کہیں سے کوئی کن کھجورا نکلے اور کہیں سے کوئی اور کیڑا۔ وہ اب سب کچھ سمجھ لینا چاہتی تھی۔

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ دن گزر گیا۔ شام ہوگئی پھر سورج بھی ڈوب گیا۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ بہت دیر میں اسے احساس ہوا کہ وہ اندھیرے میں بیٹھی ہے۔ اس نے سوچا کہ اٹھ کر لائٹ آن کر دے مگر پھر خیال آیا کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ جو کچھ سوچ رہی ہے' دیکھنا چاہ رہی ہے' اس کیلئے تو اندھیرا ہی ضروری ہے۔

پھر اسے خیال آیا کہ وقت دیکھ ہی لے۔ اس نے کلائی کو ٹٹولا۔ اس پر گھڑی نہیں تھی۔ وہ اندازے سے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔ اس نے دراز کھولی۔ گھڑی فوراً ہی اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے گھڑی کو کلائی پر باندھا۔ چمکدار سوئیوں نے اسے وقت بتا دیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔

وہ اپنے ماضی سے گزرتی رہی۔ ماضی کو اپنے اوپر گزارتی رہی۔ خود کو ٹٹولتی رہی۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتی رہی' جو پہلے نہیں سلجھی تھیں۔

صبح کا اجالا دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا تو وہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ سب کچھ سمجھ میں آیا تو اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ ارے یہ کیا۔ یہ کیسا زیاں ہے کہ کوئی تلافی بھی ممکن نہیں۔ میں سمجھتی رہی کہ پا رہی ہوں حالانکہ میں سب کچھ کھوئے جا رہی تھی۔ اب کیا ہوگا؟

اس نے اپنا' مشکور کا اور عثمان کا ہر روپ دیکھ لیا تھا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ درحقیقت اسے عثمان سے محبت تھی۔ بس وہ سمجھ نہیں سکی۔ اس لیے نہیں سمجھ سکی کہ وہ ایک فریب میں مبتلا تھی۔ مشکور کی محبت کے فریب میں اور عورت کا ذہن یہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ دو مردوں سے محبت کرتی ہے۔ مشکور کی محبت کے فریب نے اسے کبھی عثمان کی محبت کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا بلکہ اس محبت پر نفرت کا نقاب ڈال دیا۔ اس محبت کی علامتیں کئی بار ظاہر ہوئیں لیکن شعور تک نہ پہنچ سکیں اب وہ جان گئی تھی کہ عثمان نے اس کے دل کو اسی لمحے فتح کر لیا تھا' جب سہاگ رات کو اسے وہ تاج محل دیا تھا۔

اب وہ دونوں مردوں کو دیکھ سکتی تھی۔ نرم خو' نرم گفتار' خوش اطوار' انا کے طلسم سے آزاد' درگزر کرنے' بے پناہ برداشت کرنے والا عثمان مثالی مرد تھا اور مشکور..... وہ بہت گھٹیا آدمی تھا اور وہ خود ایک ناسمجھ بچی تھی' جو خود کو عقل کل سمجھ بیٹھی تھی۔

اس نے کیا کیا؟ کیا پایا' کیا کھویا؟ ان میں سے ہر جواب عذاب ہر نفس کا نقیب تھا۔ اس نے برا کیا۔ خود غرضی کے ہاتھوں لٹی۔ محبت کی تذلیل کی۔ اپنے وجود کو گالی بنا دیا۔ اپنے لیے کہیں کچھ اچھا نہیں چھوڑا۔ صرف برائی ہی برائی..... دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس نے ذلتیں پائیں۔ اپنی نظر میں' اپنے شوہر کی نظر میں..... اپنے بچوں کی نظر میں..... اور سب سے بڑھ کر اللہ کی نظر میں..... اور اس نے سب کچھ کھو دیا۔ شبنم کے قطرے سے پاک محبت۔ اپنا شوہر' اپنے بچے' اپنی عاقبت۔ اسے ملا کیا۔ اس کی بیٹی نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ وہ عقلمند ثابت ہوئی۔ اس نے عثمان کی محبت کو پہچان لیا۔ ماں کو چھوڑ دیا۔ اب وہ..... شہناز اکیلی ہے۔ اس کا کوئی مقام نہیں۔ کوئی ٹھکانا نہیں۔ وہ تنہا ہے۔ مرتے دم تک تنہا رہے گی۔

اس نے سوچا' خود کو ختم کر لے۔ ایسے کوئی جیا جا سکتا ہے لیکن دماغ نے یہ فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یوں آخرت کا بوجھ بڑھانے سے فائدہ؟ بہتر ہے' سزا جیتے جی سہہ لی جائے۔ توبہ بھی کرے۔ وہ تو بخشنے والا ہے۔ بس دل ندامت سے پانی پانی ہو کر بہہ نکلے اور اس حالت میں یہ کوئی مشکل کام نہیں پھر ایک بات اور ہے اب اسے کچھ مل تو نہیں سکتا لیکن اب وہ باقی زندگی کے ہر لمحے عثمان سے محبت تو کر سکتی ہے۔ یہ بھی تو قرض ہے اس پر اس محبت کا تو لطف ہی کچھ اور ہو گا۔

اس نے اداس نظروں سے سونے اسٹینڈ کو دیکھا' جس پر کبھی وہ جگمگاتا تاج محل رکھا تھا' جو عثمان کی محبت کی علامت تھا اب وہ خالی اسٹینڈ اس کی نفرت کی علامت بن گیا تھا۔ وہ اس کے ایک جرم کی یادگار تھا اب۔ وہ جرم جو اس نے سچی محبت جیسی نعمت عظمیٰ کو ٹھکرا کر کیا تھا۔

اب یہ پچھتاوے' یہ عذاب عمر کے تھے اور عثمان نے اسے درازی عمر کی دعا بھی دی تھی......

اسی لمحے کسی نے...... عثمان نے جیسے اس کے کان میں کہا۔ آئی لو یو...... اور پھر اس رومانوی سرگوشی کو دہراتا گیا۔ شہناز نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آئی اور اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کو چوم لیا ''تھینک یو...... تھینک یو ویری مچ۔ میں تمہاری مستحق نہیں تھی'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''لیکن تم مجھے مل گئیں۔ اب تم ہر روز ماضی کی یہ محبت بھری آواز مجھے سناتی رہنا۔''

اس نے گھڑی کو دل سے لگا لیا ''آئی لو یو...... آئی ٹرولی لو یو۔ میں تمہیں کبھی خود سے جدا نہیں کروں گی۔ تمہیں تو ہر شب احتساب کی صبح تلافی ہو۔''

گھڑی خاموش ہو گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اب یہی اس کا مقدر تھا!

